سیر الافلاک

رُوحانی مُسافتؒ کی رُوداد

بہ اجازتؒ خاتم الانبیاء سرورِکونین حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

فقیر تابش کمال

بہ اجازت خاتم الانبیاء سرورِ کونین حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فقیر باش کمال

کمال پبلی کیشنز
کی
کمال کتابیں

نام کتاب

سیر الافلاک

مصنف

فقیر تابش کمال

بار سوم

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۳۳ ہجری

آرائش، اہتمام:

نقش گر (0333-5193903)

تعداد

ایک ہزار

قیمت

تین سو روپے

ناشر

صاحبزادہ نہال بخت کمال

رابطہ

دارالکمال، نزد شیل پٹرول پمپ،
پنڈی روڈ، چکوال۔
موبائل: 0300-5144878

بسم الله الرحمن الرحيم
وما اتٰكم الرسول فخذوه
وما نهٰكم عنه فانتهوا
''جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں اسے لے لو اور جس
سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔''
(الحشر۔۷)

مطمئن سے ہو گئے ہیں یہ حقیقت جان کر
اور بھی اک زندگی ہے ماورائے زندگی

ایہہ ''سیر الافلاک'' اے تحفہ پاک محمدؐ والا

اس نوں تکن والے اتے نوری بدل ورسی

ربّ دے سوہنےؐ مینوں اج ایہہ نُختہ دسیا تابشؔ

اِس پوتھی نوں جیہڑا پڑھسی دونہیں جہانیں ترسی

مردِ چشمِ دوربیں

آشنائے سرِّ دیں تابش کمال
ہست عارف بالیقیں تابش کمال

بارگاہش مرکزِ جود و سخاست
عاشقِ شاہِ مبیں تابش کمال

عالماں از دستِ اُو شد فیض یاب
سالکاں را عبدِ دیں تابش کمال

بحرِ لطفِ اُو ندارد رنگ و ننگ
آسمانے ایں زمیں تابش کمال

عاشقاں را جانِ شیخِ کاملی
منکراں را تیغِ دیں تابش کمال

اُو کہ داند حالِ ہر پیر و جواں
مردِ چشمِ دوربیں تابش کمال

واقفِ اسرارِ صوف و صوفیاں
نکتہ دانِ عالمیں تابش کمال

فضل الرحمٰن اعظمی

پہلی بات

دینِ متین کی رفیع الشان عمارت فرامینِ الٰہی اور ارشاداتِ نبویؐ پر استوار ہے۔
قرآنِ مجید سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر احکامات کی ادائیگی کا حکم ملا اور حضورﷺ نے ان کی بجا آوری کے اصول مقرر فرمائے۔ قرآن وسنت کی پیروی ہی ایک مومن کا اعزاز ہے جو اسے دوسرے انسانوں سے ممتاز اور منفرد شان عطا کرتا ہے۔

تصوف، قولِ الٰہی اور سیرتِ نبوی ﷺ کے عاشقانہ ملاپ کا سفر ہے۔ عشق، سلوک کی انتہا اور ابتداء بھی ہے۔ صوفی کا قول وفعل رضائے شیخ، حُبِّ رسول ﷺ اور خوشنودیٔ باری تعالیٰ کے آفاق میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس دوران کچھ مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں من وتو کا فرق معدوم ہو جاتا ہے اور قلوب آئینے کی طرح صیقل

اور تابندہ دکھائی دیتے ہیں۔ ''سیر الافلاک'' انہی مقامات کا بیان اور فقیر کے روحانی سفر کی مختصر رُوداد ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموت وما فی الارض واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ و باطنہ (لقمان۔۲۰)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں کامل کر دی ہیں۔''

احوالِ مُسافت حسبِ فرمان بارگاہِ نبوی ﷺ میں عرض کیا تو آپ ؐ نے 'واذ کروا نعمۃ اللہ علیکم' (اور ذکر کرو اللہ کی نعمت کا جو تم پر ہوئی۔ آلِ عمران ۱۰۳) کی روشنی میں اسے تحریر کرنے اور ''سیر الافلاک'' کے نام سے اس کی اشاعت کا حکم دیا۔ راقم بہرحال وہی گزارشات و واقعات قلمبند کرنے کا پابند رہا ہے جن کی اجازت دربارِ اقدس ﷺ سے مرحمت فرمائی گئی۔ دمِ تحریر اس ضمن میں حد درجہ احتیاط برتی گئی کہ شریعتِ محمدی ﷺ ہی چراغِ راہ بنے۔ فقیر نے مسودہ بارگاہِ اقدس ﷺ میں پیش کیا تو آپ ؐ نے نہ صرف اسے شرفِ پسندیدگی بخشا بلکہ بعض مقامات پر اصلاح بھی فرمائی۔

راقم کے نزدیک کتب تصوف کی تالیف کا بنیادی مقصد صرف اور صرف فروغِ دینِ اسلام اور ترویجِ خیر ہونا چاہیے۔ کسی مذہب، فرقے اور جماعت کے حوالے سے مذمتی رویّہ اُمت کی تقسیم اور بنیادی جوہر (جذبۂ عشق) کے ضعف کا باعث ہی نہیں بنتا بلکہ معاشرے میں انتشار وافتراق کا موجب بھی ٹھہرتا ہے۔ وہ تمام سلاسل اور ہستیاں محترم و مکرّم ہیں جنھوں نے کسی بھی سطح پر بالیدگیٔ نفس کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے سالکین کو شوقِ سلوک دلایا اور ہر وہ شخص قابلِ ستائش ہے

جس نے دوسروں کی تکریم کا درس دیا۔

"سیر الافلاک" عنایاتِ ربانی کی شکر گزاری، تعمیلِ ارشادِ رسالت مآبؐ اور اتباعِ شیخ کی محض ایک کوشش ہے۔ اسے اہلِ عشق کے لیے پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ سالکین، شائقینِ تصوف اور اہلِ دل، تزکیۂ نفس اور پاکیزگی قلب سے بہرہ مند ہوں اور قارئین کو دولتِ ایمان، گنجینۂ عشق اور متاعِ یقین نصیب ہو۔ آمین

ایک احتیاط ضرور ملحوظ رہے کہ زیرِ نظر تصنیف کا مطالعہ طہارت و اخلاص ہی میں نفع بخش ہو سکتا ہے۔

کون اے جیہڑا چن لے جائے سچے نوری موتی
عشق محمدؐ دے دریاؤں جو تارو ہتھ لگے
حضرت باغ حسین کمالؒ اج تابشؔ ایہہ فرمایا
جو سیر الافلاک پڑھے اس دل وچ دیوا جگے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ربِ کریم نے اس کائنات کو آباد کرنے اور رونق افروز بنانے کے لیے لاتعداد انواع تخلیق فرمائیں۔تاہم وجودِ آدم کمالِ ربانی کا اچھوتا اظہار ہے۔اسے کھنکھناتی مٹی سے خلق کر کے اشرف المخلوقات قرار دیا گیا۔سورۃ رحمٰن میں فرمایا:

خلق الانسان من صلصال کاالفخار (۱۴)

''اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔''

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی نگاہوں میں عظمتِ انسان اجاگر کرنے کے لیے انھیں اس خاکی پتلے کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔ملائکہ نے بھوک، پیاس اور خواہش و مرضی جیسی آلائشوں سے منزہ ہونے کے باعث بلا تامل تعمیل کی لیکن ابلیس (عزازیل) نافرمانی کا مرتکب ہوا اور مآلِ کار نہ صرف راندۂ درگاہ ٹھہرا بلکہ اس نے انسان کو صراطِ مستقیم سے دور رکھنے کا چیلنج کرتے ہوئے طبلِ جنگ بھی بجا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اوصاف کی حامل مخلوق پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ انسان جو میرے بندے ہیں، تیرے بہکاوے میں نہ آئیں گے۔

بہشت سے ہبوط کے بعد آدم وحوا زمین پر آئے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اولاد فتنہ وفساد میں مبتلا ہوتی چلی گئی۔ انسان طبعاً ناشکرا اور زود فراموش ہے سو رفتہ رفتہ اپنا مقصدِ تخلیق ہی فراموش کر بیٹھا۔ ابو الانبیاءؑ سے خاتم الانبیاءؐ تک تمام پیغمبروں نے بنی نوع انسان میں باہمی محبت، عبادتِ الٰہی اور اجرِ آخرت کے درس کو عام کیا۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے آخری نبی، رسول اور وجہِ کائنات ہیں۔ ان پر اتاری گئی ام الکتاب ربّ کریم کی طرف سے نازل کردہ آخری کتاب ہے۔ حضرتِ اقبالؒ نے اس حقیقت کا اعتراف یقین کی انتہائی ارفع سطح پر یوں کیا ہے

پس خدا برما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اللہ کے بندے حصولِ حُبِ الٰہی اور درسِ احسان (جسے حدیثِ جبرائیل میں جزوِ دین کہا گیا ہے) کے لیے کوشاں رہے کہ یہ فریضہ اللہ اور نبی کریم ﷺ نے ان کے سپرد کیا تھا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون (النحل۔۱۲۸)

''بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور محسن بھی۔''

اسی طرح حدیثِ مبارکہ:

''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں۔''

سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء کرام یکے بعد دیگرے شریعتِ موسوی کی

متابعت فرماتے رہے اور کسی دوسری شریعت کی طرف رجوع کیے بغیر اسی کے احکامات کی تجدید و تاکید پر کاربند رہے۔ بعینہٖ علمِ حقیقی کے حامل اور عشقِ الٰہی و حب رسول ﷺ سے بہرہ مند صوفیائے کرام کو امتِ محمدیہ کی رہنمائی کے لیے بارگاہِ الٰہی اور دربارِ اقدس ﷺ سے ذمہ داریاں تفویض کی جاتی ہیں تاکہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیاد کو کمزور نہ ہونے دیں، قلوب کو آلائشوں سے پاک صاف کریں اور حضور ﷺ کی تعلیمات کے ذریعے معاشرے میں امن و آشتی کے فروغ کا باعث بنیں۔

بدقسمتی سے جدید اسلامی دنیا میں اکثر لوگ تصوف کے حوالے سے لاعلمی اور غلط فہمی کا شکار ہیں اور ''طریقت شریعت کے مقابل'' کا پراپیگنڈہ کر کے اپنے علاوہ دوسروں کی گمراہی کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عجمیت کے زہرناک اثر نے جہاں دیگر علوم و فنون کو متاثر کیا وہاں تصوف کو بھی آلودہ کیا۔ ایرانی تصوف پر صیہونی اثرات کو ہر وہ شخص ملاحظہ کر سکتا ہے جو سید علی ہجویریؒ، غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تصانیف اور صحاحِ ستہ کا ذہین قاری ہو۔ آخر اقبالؒ کا یہ جملہ کوئی تو معنی رکھتا ہے:

> ''ایران کی فتح اسلام کی شاندار کامیابی سہی، مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ تصوف کی صورت مانوی ہو گئی۔''

حقیقت یہ ہے کہ شریعت دراصل طریقت کی بنیاد اور طریقت شریعت کی نگہبان و محافظ ہے۔ جیسے وضو کے بغیر نماز جیسے فرض کی بجا آوری کے بارے میں سوچنا کارِ طفلاں ہے بالکل ایسے ہی تزکیۂ باطن کے بغیر شریعت پر پوری طرح عمل پیرا ہونا بھی غیر ممکن ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ روح کو تازگی اور خیال کو بالیدگی عطا کرنے والی اس نعمت کا زبردست، متوازن اور بھرپور اظہار کیا جائے تاکہ حقیقی تصوف کے

ناقدین اور فارسی کے اس گمراہ کن قول ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' کی قطعی تردید ہو سکے جو اس حد تک عام کر دیا گیا کہ خواندہ و ناخواندہ حضرات بلا تحقیق اس کے قائل ہو گئے۔

تصوف خود کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کرنے، اس کی رضا میں راضی رہنے اور فنا فی اللہ کی منزل کو مست الست طے کرنے یعنی پاکیزگیٔ باطن کے عمل سے گزر کر حقیقتِ مطلق سے ہمکنار ہونے کا نام ہے۔ قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر اولیاء کی مسافت اور ان کے راستے کی توثیق و توصیف ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

والذین امنوا اشد حبا للہ (البقرۃ۔۱۶۵)

''اور جو لوگ مومن ہیں اللہ ہی سے شدید محبت کرتے ہیں۔''

ایک مقام پر نبی کریم ﷺ کو تلقین فرمائی کہ مجاہدہ اور عبادت میں مصروف رہیں اور توجہ حقیقتِ ابدی کی طرف مرتکز رکھیں:

فاذا فرغت فانصب والٰی ربک فارغب (الم نشرح ۸۔۷)

''پس اے رسول ﷺ جب آپ فرضِ منصبی (تبلیغِ اسلام) سے فارغ ہوں تو عبادت میں محنت کیجیے اور اپنے رب کی طرف راغب رہیے۔''

خوشنودیٔ الٰہی کے حصول کے لیے تطہیرِ قلب ناگزیر ہے اور اس کام کی انجام دہی شیخِ کامل کے بغیر محال ہے۔ شیخ سے مراد وہ عارف ہے جو سوائے اللہ کے کسی کا خوف نہیں رکھتا اور دنیا کو پرِ کاہ سمجھتا ہے۔ سورہ یونس (۶۲) میں ارشادِ ربانی ہے:

الاان اولیاء اللہ لا خوف علیھم و لاھم یحزنون

''آگاہ رہو کہ اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

دراصل ذاتِ باری تعالیٰ شہ رگ سے قریب تر ہونے کے باوجود ایک مخفی خزانہ

ہے۔جس طرح دنیاوی علوم وفنون کی باریکیوں سے آگاہی کے لیے کسی ماہر استاد کی شاگردی ناگزیر ہے اسی طرح اللہ کی محبت جیسے سنجیدہ اور گہرے سوال کو سمجھنے کے لیے بھی ایک کامل رہبر کی پیروی لازم ہے۔کوئی اس وقت تک ان رموز سے واقف نہیں ہو سکتا جب تک اپنا ہاتھ کسی عارف کے ہاتھ میں نہ دے۔بقول حضرت مولانا اللہ یار خانؒ:

> ''کوئی علم یا فن کسی استاد کی شاگردی اختیار کیے بغیر نہیں سیکھا جا سکتا۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کا صحیح فہم حاصل کرنا کامل اور ماہر استاد کے تعلیم دینے پر موقوف ہے۔محض کتابوں کے مطالعہ سے کتاب اللہ کے اسرار اور سنتِ رسولؐ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی، پھر اس کلیہ سے تصوف کو مستثنٰی کیوں کیا جائے، اس کے سیکھنے کے لیے مرشدِ کامل کی ضرورت کا انکار کیوں کیا جائے۔'' (دلائل السلوک،ص ۳۰۲)

اس حوالے سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا فرمان دیکھیے:

> ''دین (تصوف) کا معاملہ صنائع میں کسی صنعت سے کم نہ سمجھا جائے، کوئی صنعت بھی بغیر استاد کے حاصل نہیں ہوتی پھر دین (تصوف) بغیر سیکھے کیسے حاصل ہو سکے گا۔'' (وصایا و ملفوظات)

قلب انسانی جسم کا سیّد و سردار، مقامِ الٰہی اور قصرِ عشق ہے جس کی جلا، تابندگی اور رخشندگی کے لیے کسی عاشقِ صادق کی صحبت ضروری ہے۔صوفی اور سالک کا رشتہ ایک دھاگے میں پروئے دو موتیوں جیسا ہے۔ بڑے موتی (شیخ) کی چھب جب چھوٹے موتی (سالک) پر پڑتی ہے تو وہ اور بھی جگمگانے لگتا ہے یوں اس کی وقعت پہلے سے بڑھ جاتی ہے۔بقول میرزا عبدالقادر بیدل:

صحبتِ صاف دلاں جوہر اکسیر غناست

بے صدف قطرہ محال است کہ گوہر گردد

یعنی صاف دلوں کی صحبت اکسیر ہے جو انسان کے اندر نغمۂ عشق جگاتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی قطرہ، سیپی کے بغیر موتی بن جائے۔

دل خواہشوں کا مرکز، آرزوؤں کی آماجگاہ اور تمناؤں کا منبع ہے۔ یہ مقام ارمانوں اور حسرتوں سے عبارت ہے۔ سالک جب تک بیت القلب میں صرف اور صرف محبوب کو بطور مقصود نہ بسالے پاکیزگیٔ نفس کا حامل نہیں ہوسکتا۔ محبوبِ حقیقی کے شایانِ شان بنانے کے لیے اسے آلائشوں سے پاک رکھنا ضروری ہے کیونکہ جلوہ گاہِ حقیقت میں ریا و دغا کی کوئی گنجائش نہیں۔ سید عبدالکریم جیلانیؒ نے اس حقیقت کی عجیب منظر کشی کی ہے:

القلب عرش الله ذوالامکان

هو تیه المعمور فی الانسان

فیه ظهور الحق فیه لنفسه

و علیه حقا مستوی الرحمن

خلق الاسرا القلب مرکز سره

و محیط دور الکون والاعیان

"قلب بااقتدار اللہ کا عرش ہے اس کی ہویت انسان میں معمور ہے یعنی تمام وجودِ انسانی میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ قلب میں حق کاظہور ہے۔ بالتحقیق قلب رحمٰن کی قیام گاہ ہے۔ باری تعالیٰ نے دل کو اپنے راز کا مرکز بنایا ہے۔"

درحقیقت نفسِ امّارہ اور نفسِ لوامہ کا خروج نفسِ مطمئنہ کے قیام کا استعارہ

ہے۔ نفسِ راضیہ کے حصول اور جوہرِ حقیقی تک رسائی کے لیے صاف فضا اور نوری ماحول مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ جسم سے اٹھ کر جوہر اور جوہر سے آگے نفسِ کلیہ تک پہنچنا ہی سلوک کا مدّعا ہے۔ اس نفس کے تحت ہر قسم کی مخلوق ہے علوی بھی، سفلی بھی لیکن یہ بجائے خود کسی کا عین و غیر نہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ اس سے کہیں آگے جلوہ گر ہے کیونکہ عین اور غیر عین اس کے احاطۂ نور وظہور سے قاصر ہیں یعنی نفسِ کلیہ کے بعد نفسِ اعتبار ہے جو طالبِ حقیقی کی معراج ہے۔

برِ صغیر بالخصوص اور عالمِ اسلام بالعموم تصوف کے معاملہ میں گم کردہ راہ ہو چکا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ قوت القلوب، اللمع فی التصوف، التعرف المذہب اہل التصوف اور طبقات الصوفیہ جیسی تصنیفاتِ عرش صفات کی موجودگی میں یہ موشگافیاں ہوئی ہوں کہ تصوف ہرزہ کاروں کی جائے پناہ بن گیا تھا۔ قرآن وحدیث میں واضح طور پر تصوف کا جمال وجلال افروز بیان ملتا ہے۔ خاص طور پر سورۃ انفال کی یہ آیت یہود پرست دشمنانِ اسلام کے لیے تازیانہ ہے جو شہادتِ تصوف فی القرآن کے منکر ہیں:

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی (۱۷)

''اور اے رسول ﷺ جب آپؐ نے مٹھی بھر کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ آپؐ نے نہیں بلکہ (دراصل) اللہ نے پھینکی تھیں۔''

یہاں رسولِ پاکؐ کی حیثیتِ مبارکہ ایک سالک کی ہے جبکہ ربِّ کریم ایک شیخ کے طور پر آپ ﷺ کی پشت پناہی فرما رہے ہیں۔ جنگِ بدر میں مسلمانوں کی قلیل تعداد اور نامساعد حالات کے باوجود فتحِ مبین صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مددِ غیبی تھی۔ معلوم ہوا کہ شیخ ظاہری وباطنی ہر دو ذرائع سے سالک کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام اللہ کے سالک ہیں۔ یہ مرتبۂ بلند صرف حضور ﷺ کو عطا ہوا

کہ محبوبِ حق قرار پائے اور ربِ کائنات اور فرشتے آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں:

اللھم صل علی محمد ن النبی الامی

وعلی الہ وصحبہ وبارك وسلم

''اے میرے پیارے اللہ، محمد ﷺ نبی اُمّی (مکّی) پر اور اُن کی آل اور اصحاب پر صلوٰۃ و سلام اور برکتوں (کے پھول) نچھاور فرما۔''

سچّی طلب اور ذوقِ سلیم کے حامل کسی شخص کو اگر خوش بختی سے مرشدِ کامل میسّر آجائے تو پھر باقاعدہ تربیت کے لیے بیعت کا مرحلہ آتا ہے۔ بیعت دراصل مرشد کے حکم پر سر جھکا دینے اور فرمودۂ شیخ سے سرِ مُو انحراف نہ کرنے کا نام ہے۔ اولیاء و علماء نے بیعت کی تاریخی اہمیت بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ قبولِ اسلام کے وقت صحابہ کرامؓ کی بیعت، ہجرت کے لیے بیعت، جہاد کے لیے بیعت، معاہدے کی پاسداری اور تقویٰ پر قائم رہنے کی بیعت۔ ہر بیعت کی بنیاد امر بالمعروف و نھی عن المنکر ہے۔ خاص طور پر خلافتِ راشدہ کے بعد جب مسلمانوں میں بادشاہت و ملوکیت رائج ہوئی تو صوفیاء نے اسی آیتِ مبارکہ کو مدعائے تصوف مان کر بیعت کو جاری رکھا۔ نیک کاموں کی انجام دہی و تبلیغ اور بُرے کاموں سے پرہیز سالک کے لیے ابتدائی درس ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے حضرت جریرؓ سے بیعت لی اور فرمایا:

''تم پر ہر مسلمان کی خیر خواہی لازم ہے۔''

اسی طرح بہت سارے انصار سے بیعت لی گئی۔ شیخ کی رضا اور خوشنودی کے مطابق امورِ بیعت کی انجام دہی سالک کے لیے بنیادی امر ہے۔ نبی کریمؐ کا ارشادِ پاک 'الفقر فخری' گویا فقر کی نعمتیں عطا کرنے والے رب کے سامنے عاجزی اور

محتاجی کا اظہار ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے مسکینوں میں اٹھایا جانا پسند فرمایا۔ سو ایک سالک شیخ کی دنیاوی حیثیت نہیں دیکھتا۔ وہ صرف اور صرف رضائے شیخ کا طالب ہوتا ہے۔ وہ زبانی نہیں قلبی سطح پر بھی یہ عہد اور اقرار کرتا ہے کہ اپنے مرشد کی رہنمائی میں اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسولؐ پر کاربند رہے گا۔ یوسف سلیم چشتی 'تاریخِ تصوف' میں لکھتے ہیں:

"بیعت نصِ قرآن میں شامل ہے بلکہ تجدیدِ بیعت بھی۔"

فقیر کے خیال میں اس ضمن میں ایک یہی آیت منکرینِ تصوف کے اصلاحِ احوال کے لیے کافی ہے۔

لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبا یعونك تحت الشجرۃ (الفتح۔۱۸)

"بے شک اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جس وقت وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کرتے تھے۔"

مسلک تصوف میں بیعت سے مراد محض یہ نہیں کہ کسی شخص کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر زبانی اقرار کرلیا جائے کہ بیعت کرنے والا اعمالِ صالحہ انجام دے گا بلکہ سالک و شیخ دونوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے معاملات پر غور کرتے ہوئے مطلوب کو بہر کیف مدِ نظر رکھیں۔ فنا فی الشیخ کے ابتدائی مرحلہ کے بعد فنا فی الرسول ﷺ کی منزل آتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سوغات نبی کریمؐ کی انتہائی عقیدت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کے بعد ہی مقصودِ حقیقی فنا فی اللہ کا مقام حاصل ہوسکتا ہے۔

عارفِ کامل کی زندگی سماجی اور روحانی سطح پر عام آدمی سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی پیروی اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔

اسے ''بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ'' کا درس ہمیشہ از بر ہوتا ہے اور وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا میں نہیں ہوتا، کارِ جہاں کی انجام دہی کے دوران بھی:

؎ یہ ہمی ہیں جو تری یاد بسا کر دل میں
کام دنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں

کے مصداق اس پر ''دست بہ کار دل بہ یار'' والی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اگر شیخ کتاب و سنت پر کاربند ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے متوسل در در کی خاک چھانتے پھریں۔ اور مرید کو بھی اگر خوبیٔ قسمت سے ایسا گوہرِ نایاب ہاتھ آ جائے تو بیعت و ہدایت پر قائم رہتے ہوئے جگہ جگہ ماتھا ٹیکنے کی بجائے:

؎ لوکاں لبھے ون سوّنے بیلے بنّے
میں تے ہکا تیں سنگ لائیاں مرشد سائیاں

کا سبق یاد رکھنا چاہیے۔ ایک عارف کی نگاہِ کمال کسی طور اکسیر سے کم نہیں۔ وہ جوہر دیکھ کر نفسِ کلیہ تک لے جاتا ہے۔ الحمدللہ عالمِ اسلام ایسے مردانِ کامل سے کبھی محروم نہیں رہا۔ لیکن یہاں یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی کہ اس امر کے دعویدار تو ہر دور میں رہے ہیں لیکن ماہیتوں کے سلسلے میں اعیانِ ثابتہ کی شناخت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

؎ ہر مسافر پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

حقیقت یہ ہے کہ چند آستانے ہی اس لائق ہوتے ہیں کہ وہاں سرِ تسلیم خم کیا جائے ورنہ خرد کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بندہ جنوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور یوں ہوش کے بیوپار میں یہ سودا بہت مہنگا پڑ جاتا ہے۔ یہ امتِ مسلمہ کی خوش بختی ہے کہ اللہ کریم نے مومنین کی ہدایت اور رہنمائی کے خصوصی انتظامات فرما رکھے ہیں۔

جب مومن اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو ستر (۷۰) ماؤں سے زیادہ مہربان ذات اپنی شفقتوں اور رحمتوں کے دراس پر یوں وا کر دیتی ہے کہ منازل، مناصب اور مراتب اس کی راہ تکنے لگتے ہیں۔ یہاں ستر ماؤں کا ذکر بھی استعارۃً آیا ہے۔ اس نکتے کی تفہیم انسان پر حیرت کے در کھولتی چلی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فقیر کے استفسار پر ارشاد فرمایا کہ اماں حواؑ سے لے کر حضرت سیدۃ النسا فاطمہ زہراؓ تک ستر بہترین مائیں مراد ہے۔ یعنی ذاتِ باری تعالیٰ پوری انسانی تاریخ کی ستر بہترین ماؤں سے بھی زیادہ مہربان ہے اور اپنے بندوں پر نہ صرف رحم فرماتی ہے بلکہ ان کی خطاپوشی بھی کرتی ہے۔ اب یہ سالک کا کام ہے کہ زینے طے کرتا چلا جائے۔ شرط صرف عملِ پیہم کی ہے۔ اس سلسلہ میں جدوجہد کرنے والوں کو مژدہ سنایا گیا ہے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللہ لمع المحسنین (العنکبوت۔۶۹)

''اور جو لوگ ہم سے ملنے یا ہم تک پہنچنے کے لیے مجاہدہ کرتے ہیں، ہم یقیناً انھیں اپنی طرف آنے والی راہیں دکھا دیتے ہیں۔''

گویا سالکین کی پرورش اور افزائش کا اہتمام خود اللہ اور اس کے رسولؐ فرماتے ہیں لیکن دربارِ رسالت تک باریابی شیخ کا دامن تھامے بغیر قطعی ناممکن ہے۔ راقم کی نظر سے ایک بھی ایسا واقعہ نہیں گزرا جس میں کوئی سالک مرشدِ کامل کی رہنمائی کے بغیر سرسبز ہوا ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علم و عمل دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ تاہم علم و عمل، عشق کو اور عشق ان دونوں کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ ورنہ بقول حضرت سلطان باہوؒ:

ساون ماہنہ دے بدلاں وانگوں پھرن کتاباں چائی ہو

والا ناٹک ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اگر ایک لفظ میں تصوف کو واضح کیا جائے تو وہ لفظ ہے ''عشق''۔ یہ عشق ہی تھا جس نے مولانا رومؒ جیسے عظیم عالم کو شمس تبریزیؒ کے سامنے سر نیہوڑانے پر مجبور کر دیا۔ حقیقت لباسِ عشق میں جلوہ گر ہوئی تو سب کچھ ہیچ معلوم ہوا اور رومیؒ:

؎ مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

کہتے ہوئے فنافی الشیخ ہو گئے۔ یہ انتہائے عشق، حبِّ شیخ کی منزل کا اوّلین زینہ ہے۔ مرشد کی توجّہ اور فیضانِ نظر ہی سالک کو اللہ سے جوڑتا اور صراطِ مستقیم پر لاتا ہے۔ بیعت مکمل سپردگی ہے اور نفیٔ ذات۔ ہر غیر کی نفی سوائے ذاتِ حق کے، تاہم اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ نفیٔ ذات سے مراد خود کو بھلانا نہیں بلکہ حقیقتِ عظمیٰ کے سامنے سرنڈر (Surrender) کرنا ہے، یعنی سالک:

''تو جس بات پہ راضی مولا، تابش بھی اس بات میں خوش''

کی تفسیر بن کر اس عقیدہ کا حامل ہو جائے کہ اس کی بقا صرف اور صرف قربِ باری تعالیٰ میں ہے۔ بہت سے حضرات اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کی من پسند تفسیر و تشریح سے سادہ دلوں کو گمراہ کرتے ہیں جبکہ اقبالؒ نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ اپنی خودی سے غافل انسان ہرگز ہرگز داخلِ جنت نہیں ہوں گے۔ انسان کو اپنے نفس کی شناخت و معرفت کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ بندہ اپنے رب کو پہچان سکے۔

؎ نصیر کھیل نہیں ہے شعورِ ذات وصفات
خدا شناس کہاں وہ جو خود شناس نہیں

یعنی حفاظتِ خودی بھی خوشنودیٔ باری تعالیٰ کا ایک ذریعہ ہے۔

سلوک جسے کتبِ احادیث میں لفظِ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے دراصل

حقیقتِ عظمیٰ کی تلاش کا سفر ہے جس میں عبادات و مجاہدات چراغِ راہ اور زادِ سفر کا کام دیتے ہیں۔ خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کو اخروی زندگی کے لیے رختِ سفر تیار کرنے کا حکم دیا ہے:

ولتنظر نفس ماقد مت لغد (الحشر۔۱۸)

''اور لازم ہے کہ ہر شخص یہ دیکھتا رہے کہ اس نے کیا توشہ آئندہ کل کے لیے بھیجا ہے۔''

فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق:

حفت الجنه بالمكاره و خفت النار بالشهوات

''جنت ان باتوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں اور دوزخ شہوتوں سے گھری ہوئی ہے۔'' (مسندِ احمد۔ مسلم شریف)

بخاری شریف کی ایک اور حدیثِ مبارکہ ہے:

احب الصلوة الى الله صلوة داؤد عليه السلام واحب الصيام الى الله صيام داؤد و يقوم ثلثه و ينام سدسه و يصوم يوما يفتر يوما

''سب نمازوں میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ نماز داؤدؑ کی نماز ہے اور روزوں میں بھی داؤدؑ کا روزہ۔ آپ آدھی رات تک سوتے اس کے بعد تہائی رات نماز پڑھنے میں گزارتے۔ پھر رات کے چھٹے حصے میں بھی سو جاتے اسی طرح آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔''

اس حدیثِ مبارکہ کے مطابق پیغمبر صاحبِ زبور بھی دراصل ایسے سالک تھے

جو فراوانیٔ مال کے باوصف بارگاہِ تعالیٰ میں مجاہدہ کیا کرتے۔

عبادت و مجاہدات میں شدید توجہ لطف و احسان کا موجب ہے۔ کون جانے کس آن دریائے رحمت جوش میں آجائے اور کناروں پر کھڑے سائل انمول موتیوں سے نواز دیے جائیں جبکہ اس ذخّار کے شناور کی تو شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ اسی لیے صوفیاء نے اپنی زندگیاں مجاہدات و ریاضت میں صرف کیں اور خوشنودیٔ باری تعالیٰ کے جزاوار ہوئے۔ راقم کے پاس بہت سے ایسے لوگ آتے ہیں کہ اہلیت رکھتے ہیں، ان کی قلبی کیفیت بھی بہت خوب ہوتی ہے مگر مجاہدہ و ریاضت سے گھبراتے ہیں۔ شوقِ عبادت و مجاہدہ ہی اکسیر ہے جو آئینۂ قلب کی صفائی اور روحانی بالیدگی کا کام کرتا ہے۔

مجاہدات و عبادات کے علاوہ عقیدت و احترام اور سچی اطاعت ہی وہ ذرائع ہیں جو سالک کو نگاہِ شیخ میں نوازے جانے کے قابل ٹھہراتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ و سالک کا علمی مرتبہ بھی حقیقتِ کاملہ کی طلب میں معاون ٹھہرتا ہے۔ اسلامی تصوف کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ صوفیائے کرام نے اس معاملہ میں بہت کاوش و کد سے کام لیا ہے۔ حضرت ابوطالب مکیؒ نے 'قوت القلوب' کی دوسری جلد میں حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

> ''میں نے پہلے حدیث و فقہ کا علم حاصل کیا پھر حضرت حارث المحاسبیؒ سے 'کتاب الرعایۃ' کا درس لیا جس کے باعث کامیابی ہوئی۔ سو وہ شخص جو قرآن و حدیث کا علم نہ رکھتا ہوا سے دوسروں کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں ہے۔''

اللہ اکبر، کیا مقام اور کیا احتیاط ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بھی درس ہے

جو تصوف کے نام پر امت کو ظلمات کی طرف لیے جاتے ہیں۔ حضرت محاسبیؒ کی احتیاط پسندی اس سلسلہ میں ایک مثال ہے کہ محض اس لیے اپنے والد کے ترکے سے دست بردار ہو گئے کہ والد مجوسی تھے۔ آپؒ کی یادگار تصنیف 'الرعایہ' آج بھی طالبانِ حق کی رہنما ہے۔ فقیر نے یہ کتاب اپنے شیخ کے ہاں دیکھی تو آپؒ کی اجازت سے کچھ عرصہ اس سے استفادہ کیا، خصوصاً ندامت اور اعمال کے ابواب سے خوب فائدہ اٹھایا۔ بعد میں جب روحانی ملاقات ہوئی تو حضرت محاسبیؒ نے بہت شفقت فرمائی۔

یوں تو قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت مبارکہ مومنین اور سالکین کو ہدایت کرتی ہے اور اس میں موجود روشنی دلوں کو منور اور جہانوں کو مسخر کرتی ہے مگر 'سورۃ مزمل' اس ذیل میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ فقیر اس سورۃ کو تصوف کا منشور (Manifesto) سمجھتا ہے کہ یہ نکتہ بہ نکتہ اولیاء کے طرزِ حیات سے معمور ہے۔ مصنف 'تاریخِ تصوف' نے بہت خوبصورتی اور جامعیت سے اس کی تشریح کی ہے البتہ راقم کو تائیدِ ربّانی کی بدولت مزید نکات کا فہم بھی عطا کیا گیا۔ توفیقِ الٰہی سے مجھ پر کھلا کہ "**قم اللیل**" سے مراد عشاء کے تین گھنٹوں بعد قیام کرنا ہے۔ یہ حکم صرف اس لیے صادر ہوا کہ دینِ اسلام انسان کو اپنی جسمانی صحت کا خیال رکھنے کی بھی تاکید کرتا ہے۔

ورتل القرآن ترتیلا

"اور دھیرے دھیرے (ٹھہر ٹھہر کر) قرآن پڑھا کرو۔"

یہاں رُک رُک کر پڑھنے کی تلقین کا سبب یہ ہے کہ تفہیم کی جانب توجہ رہے۔ حضرت امام حسنؓ اور حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ کی روایات سے ثابت ہے کہ حضورﷺ نے ایک شخص کو قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ آہستہ آہستہ پڑھو تا کہ سمجھ سکو۔ اسی طرح کتبِ سیرت میں مرقوم ہے کہ آپﷺ کوئی بھی بات، بعض اوقات

تین تین مرتبہ ارشاد فرماتے تا کہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں۔

ان ناشئة الیل ھی اشد و طا واقوم قیلا

''بے شک رات کو اٹھنا (نفس پر) قابو پانے کے لیے بہت ہی کارگر ہے اور پڑھنے (ذکر) کے لیے بہت ہی خوب وقت ہے۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ بے شک رات کا قیام نفس کو کچلنے اور ذکر اللہ کے لیے بہترین ہے۔ یہاں نفس کشی کے حوالے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ حقیقی صوفی نفس کو مفقود نہیں بلکہ معدوم سمجھتا ہے۔ مفقود ہونا اس بات کا آئینہ دار ہے کہ اہلِ نفس کے لیے، نعوذ باللہ، اللہ کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے جبکہ معدوم ہونا اس امر کا غماز ہے کہ نفس رضائے ربانی اور حکمِ باری تعالیٰ کی بلا تامل پیروی کرے۔ معدوم ہونا یہ تسلیم کرنا ہے کہ ہمارا ہر قول اور فعل اللہ کو حاضر ناظر مان کر ترتیب پاتا ہے۔ خواہش کا اظہار نفس کو زیب ہی نہیں دیتا کیونکہ سب سے بڑی خواہش قربِ اللہ ہے، باقی سب کچھ ہیچ۔ دیگر آرزوؤں کی موجودگی میں حقیقت کا انعکاس دشوار ہو جاتا ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ میں معدوم ہوں وہ یہ بھی جانتا ہے کہ صرف اللہ موجود ہے لیکن اس کا علم محض عقل سے نہیں بلکہ عرفان سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تصوفِ اسلامی کا امتیاز اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ مشائخ اپنے شاگردوں کو شدت کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ اور نفس کشی کی تاکید کرتے ہیں۔ گزشتہ سطور میں قرآن کی دو آیات کا حوالہ آیا کہ ربّ العزت اپنے محبوب ﷺ کو جہدِ عبادت کی تلقین فرماتے ہیں، گویا رات کا قیام اور ذکرِ الٰہی حکمِ الٰہی کے علاوہ سنتِ نبویؐ بھی ہے۔ اس سورۃ کی اگلی آیت فقیر کے نزدیک سورۃ کا قلب ہے۔ اس کے طفیل سیر الافلاک کے دوران عنایات کی بے پناہ بارش ہوئی۔ مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ آیت اللہ کی عظمت کا اظہار اور انسان کا مقصدِ حیات ہے۔

واذکر اسم ربلک

''اور اپنے پروردگار کو (باقاعدہ) نام لے کر یاد کر۔''

اسمائے باری تعالیٰ اور صفاتِ الٰہی میں بے شمار اعزاز پوشیدہ ہیں اس لیے خالق کائنات کو نام لے کر پکارنا گویا تمام صفتوں کا قلبی وقولی اعتراف کرتے ہوئے اقرارِ کلی کا حامل ہونا ہے۔ اقرارِ قولی، اقرارِ فعلی، اقرارِ وجودی، اقرارِ سرّی، اقرارِ عینی، اقرارِ قلبی سب اقرار کی اقسام ہیں تاہم اقرارِ کلی کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

و تبتل الیہ تبتیلا

''اور دنیا کے معاملات سے قطع ہو کر اپنے پروردگار کو یاد کرو۔''

اس آیہ کی تفہیم میں یہ احتیاط لازم ہے کہ اسے ترکِ دنیا سے نہ جوڑا جائے۔ اللہ پاک نے یہاں فقط یہ فرمایا ہے کہ راجع پر لازم ہے کہ جب عبادت کرے تو اپنی ذات سمیت ہر خیال کو یکسر بھلا دے۔ تاریخ میں کتنے ہی واقعات ہیں جو غازیوں کی نماز میں محویت پر شاہد ہیں۔ کسی کو بچھونے کاٹا مگر نماز قطع نہیں ہوئی، کسی کے تیر لگا مگر خشوع وخضوع میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ کسی کا گلا کٹا مگر مجال ہے کہ سر سجدے سے اٹھا ہو، یہ ہے 'تبتل' یعنی:

بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم

کہ تمام شد رکوعے کہ امام شُد فلانے

کی عملی تصویر۔ اگلی آیت میں اللہ کی کارسازی کی طرف اشارہ ہے:

فاتخذہ وکیلا

''صرف اللہ کو اپنا وکیل بنا۔''

اللہ ہی عادلِ مطلق ہے، یومِ جزا وسزا کا مالک۔ عین اور غیر عین سے ماورا

ہوتے ہوئے بھی شاہد۔ سالک جب اپنے شیخ کی بیعت کرتا ہے تو اس کے معاملات مختلف وسیلوں سے ہوتے ہوئے بارگاہِ ایزدی تک پہنچتے ہیں۔ پہلا وسیلہ شیخ ہے جو اگر کامل ہے تو اپنی لیاقت و فراست سے صدیوں کا سفر چشمِ زدن میں طے کرا دے۔ الحمدللہ راقم کے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ کی نگاہِ التفات نے کئی بار اس نعمتِ غیر مترقبہ سے نوازا۔ میں نے آپؒ کو اس حدیثِ مبارکہ کی تفسیر پایا:

اتقوا فراسته المؤمن فهو ينظر بنور الله (ترمذی شریف)

''مومن کی فراست سے ڈرتے رہو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

اللہ کا یہ نور بہت بڑا انعام اور عظیم عطا ہے جس کے بارے میں واضح ارشاد ہے:

يهدى الله لنوره من يشاء

''اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔'' (النور۔۳۵)

کارسازیٔ باری تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی سندِ نجات نہیں، ذاتِ احد کو وکیل بنانے کا مطلب یہ ہے کہ سالک کے ہر عمل کا ثبوت اور دلیل دفترِ حق میں مرقوم ہے۔ سالک جب اپنے شیخ کی بیعت کے عمل سے گزرتا ہے تو گویا اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے ربِّ کریم کو سب سے بڑا عادل اور حفاظت کرنے والا تسلیم کر لیا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

فالحكم لله العلى الكبير (المؤمن۔۱۲)

''اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر ہی کا ہے۔''

یوں سالک انسانی تحویل کو ترک کر کے اس نکتے پر ایمان لے آتا ہے کہ تمام اختیار صرف اور صرف ربّ العالمین کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ بادیۂ عرب کا فصیح اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے:

ے وکلت الی المحبوب امری کلہ

فان شاء احیانی وان شا اتلفا

''میں نے اپنا کام محبوب کے سپرد کر دیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا

مار ڈالے۔''

اگلی آیت میں فرمایا گیا:

واصبر علی ما یقولون

''اور غیروں (جو الگ مذہب رکھتے ہوں) کے اعتراضات پر صبر سے

کام لو۔''

دشنام طرازی اور بہتان پر خاموش رہنا ربِ کریم کا حکم اور سالکین کی روش ہے۔ مولانا رومؒ نے کسی شخص کے سوال پر کہ آپؒ سب فرقوں سے متفق ہیں اثبات میں جواب دیا تو سائل نے آپؒ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ اگرچہ حضرتؒ کے بہت سے شاگرد موجود تھے لیکن آپؒ نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار فرمالی کہ میں اپنے حوالے سے تمہارے خیالات پر بھی متفق ہوں۔ عارف فضول گفتگو اور لایعنی اعتراضات کو صبر سے برداشت کرتا ہے۔ تاریخ میں ایسے ہزاروں واقعات ہیں کہ اہل اللہ کو ہر قسم کی ایذا دی گئی مگر وہ تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے طریق پر قائم رہے۔

وھجرھم ھجرا جمیلا

''اور نفاست سے کنارہ کشی اختیار کرو۔''

نبی کریم ﷺ کی ہجرت اس امر کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ نے خلقِ عظیم کا نمونہ دکھاتے ہوئے کنارہ کشی فرمائی۔ آپؐ کے اصحابؓ کبھی حبشہ گئے کبھی شعب ابی طالب میں بھوکے پیاسے پناہ گزیں رہے اور کبھی مدینہ کا سفر اختیار فرمایا۔

ہجرت انبیاء کی سنت اور اولیاء کا ورثہ ہے، امرِ ربانی کی تعمیل میں ہجرت کرنا اجرِ عظیم کی جانب جانا ہے۔

وذرنی و المکذبین

''اور انکار کرنے والوں (جھٹلانے والوں) سے مت الجھو۔''

آپ ﷺ نے جب اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق پیغامِ اسلام عام کیا تو خونی رشتہ دار تک آپؐ کے درپے ہو گئے مگر یہ استقامت ہی تھی کہ تکذیب کرنے والوں نے بھی ہمیشہ اپنی امانتیں آپ ﷺ کے پاس رکھوائیں۔ اولیائے کرام نبیٔ کریمؐ کے وارثانِ حقیقی ہیں کہ اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود انھوں نے اخلاقِ طیبہ کو بروئے کار لا کر دنیا کے سامنے امن و آشتی کی مثالیں قائم کیں۔

یہ فقط فضلِ باری تعالیٰ ہے کہ تصوف کے ثبوت میں قرآنِ کریم کی آیات نصرت کا باعث بنیں۔ بادۂ رحمٰن کی مستی کہتی ہے کہ مے خانۂ احمدی ﷺ سے بھی دو چار جرعے اس مد میں لیے جائیں تا کہ دلائل قاطع کے ساتھ صیہونی پراپیگنڈے کی تردید و تنسیخ ہو سکے۔

بخاری شریف جلد اول، صفحہ ۹۳ پر عبداللہ بن مسلمہؓ کی روایت درج ہے جو حضرت ابو سعید حذریؓ تک پہنچتی ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

قول النبی انا اعلمکم باالله وان المعرفته فعل القلب

''میں سب سے زیادہ اللہ کا جاننے والا ہوں اور معرفت دل کا فعل ہے۔''

ابنِ رجب حنبلیؒ کے مطابق ایک حدیث شریف میں مقامِ ولایت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

من ركع الی مولی ومال الیه احرقه الله بنوره حتی یصیر جوهر لا قیمة له

''جو اپنے اللہ کی طرف جھکتا ہے اور اس کی سمت مائل ہوتا ہے تو اللہ اُسے اپنے نور سے جلا دیتا ہے تا آنکہ وہ ایک انمول موتی بن جائے۔''

(جامع العلوم، ص ۳۹۸)

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے حوالے سے عجلانیؒ نے ''کشف الخفاء'' میں ایک واضح حدیثِ مبارکہ نقل کی ہے:

الشریعت اقوالی و الطریقت افعالی والحقیقت احوالی و المعرفت اسراری

'' شریعت ہمارے فرمان ہیں طریقت ہمارے افعال ہیں حقیقت ہمارے احوال ہیں اور معرفت ہمارے اسرار ہیں۔''

اگر چہ منہاجِ محمدی ﷺ پر یقین رکھنے والے قارئین جان چکے ہیں کہ اب تک کی سطور میں معترضینِ تصوف کا تسلی بخش جواب دیا جا چکا ہے تاہم کوئی عاشق و سالک معلوم کرنا چاہے کہ نامور صحابہ کرامؓ اور اولیائے کرام نے تصوف اور صوفیاء کے باب میں بطور تعریف کیا رقم فرمایا ہے تو اس کی تشفی کے لیے بھی ناقابلِ تردید شہادتیں موجود ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بقول:

''ولی اللہ وہ ہے جس کو دیکھنے سے اللہ یاد آ جائے۔''

حضرت ذوالنون مصریؒ بہت برگزیدہ اور عظیم رتبے کے اولیاء میں سے ہیں۔ آپؒ سے دریافت کیا گیا کہ صوفیاء کون لوگ ہیں تو آپؒ نے فرمایا:

''وہ لوگ جو سب کچھ چھوڑ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ انھیں

سب چیزوں سے زیادہ پسند کرتا ہے۔''

(تاریخِ تصوف دراسلام، ص ۱۹۸)

حضرت سہل بن عبداللہ تُستریؒ کے نزدیک:

''صوفی وہ ہے جو کدورت سے صاف ہو، تفکر سے پُر ہو، اللہ کے قرب میں بشر سے علیحدہ ہو اور اس کی آنکھ میں خاک و زر یکساں ہو۔''

(ذکرِ جمیل، ص ۳۱۴)

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ صوفی خود کو مٹا کر حیاتِ دائمی حاصل کرتا ہے۔

هو ان يميتك الحق عنك يحيد به

''صوفی اپنی ذات میں فانی اور ذاتِ حق میں باقی ہوتا ہے۔''

(رسالہ قشیریہ، ص ۱۲۶)

حضرت ابوالحسن نوریؒ کے مطابق:

''صوفیاء ایسی جماعت ہیں کہ ان کی جانیں بشری کدورت سے مبرّا ہو گئی ہیں نفس کی آفتوں سے محفوظ ہو چکی ہیں اور ہوا و ہوس سے چھٹکارا حاصل کر چکی ہیں۔ سب سے اعلیٰ منزل میں حق تعالیٰ کے ساتھ امن میں ہیں اور غیر اللہ کے خیال سے دور ہیں۔''

(تصوف اور سرّیت، ص ۱۱۷)

حضرت امام غزالیؒ اپنی کتابِ لاجواب **المنقذ من الضلال** میں فرماتے ہیں:

''جب میں ان علوم سے فارغ ہو کر صوفیاء کے طریق کی جانب متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کا طریقہ علم و عمل سے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ان کے علم کا حاصل نفس کی گھاٹیوں کو قطع کرنا اور مذموم اخلاق اور صفاتِ خبیثہ

سے پاک ومنزہ ہونا ہے تاکہ اس کے ذریعے دل کو غیر اللہ سے خالی کر
کے ذکرِ الٰہی سے آراستہ کیا جائے۔''

معلوم ہوا کہ شیخؒ نے حکمِ شریعت کے عین مطابق تصوفِ پاکیزہ اختیار کرتے ہوئے آئینۂ قلب کی صفائی کا اہتمام فرمایا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ 'عوارف المعارف' میں لکھتے ہیں:

فلیعکم انا نعتی بالصوفیه المقربین

''ہم صوفیا کا مطلب مقربین ہی سمجھتے ہیں۔''

نزدیک ہونا قرابتِ محض نہیں بلکہ مقبولِ بارگاہِ ربّانی ہونا ہے۔ قربِ باری تعالیٰ مومن کی معراج اور سالک کے لیے عید کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا حصول نہایت دقت طلب کام ہے۔ اسی لیے ملائکہ کے علاوہ صوفیائے کرامؒ کو ہی مقربین کہا گیا۔

قرب اللہ دراصل قرب من اللہ ہی ہے یعنی بغیر توفیق اور بنا اذن اس کا حصول ناممکن ہے۔ قربت محض فاصلہ جاتی نہیں بلکہ سپردگی کا وہ مقام ہے جہاں سالک، ذاتِ کل کا اثبات کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ''تقربو، اقرب، مقربین، قرب'' کے کلمات جہاں بھی وارد ہوئے ہیں اثباتی ہیں، حیرت ہے کہ کسی مقام پر نفی مراد نہیں۔ یہ آیتِ مبارکہ:

و نحن اقرب الیه من حبل الورید (ق۔١٦)

''اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی بہت قریب ہیں۔''

دراصل ''ہر جائی ہو'' کے اعلان کے علاوہ اس اثبات کی کامل دلیل بھی ہے۔

خواجہ حافظ شیرازیؒ نے اس مرحلے کو اور بھی باریکی سے طے کیا کہ قرب و بُعد اعیانِ ظاہرہ کو لازم ہے، عاشق پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

؎ در راہِ عشق مرحلۂ قرب و بعد نیست
می بینمت عیان و دُعا می فرستمت

''عشق کے راستے میں دُوری اور نزدیکی کا معاملہ نہیں ہے۔ میں
تجھے ظاہراً دیکھ رہا ہوں اور تیرے لیے دعا گو ہوں۔''

میں نے ایک بار یہی سوال اپنے شیخِ مکرم حضرت باغ حسین کمالؒ سے کیا تو آپؒ نے فرمایا:

''بیٹے! شریعت سراسر خوفِ الٰہی اور طریقت سراسر عشقِ الٰہی ہے۔ جس
کے اندر یہ دونوں امور یکجا ہو جائیں وہ ولی ہوتا ہے۔''

یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ علمِ تصوف و سلوک میں دل کو بنیادی مرتبہ حاصل ہے۔ ذکر و مراقبہ میں سانس کا زیر و بم اور مقامِ قلب کے عین درمیان اسمِ ذاتِ باری تعالیٰ ''اللہ'' کی ضرب سے پورا بدن جھنجھنا اٹھتا ہے۔ یہ عمل گویا سہ تار پر مضراب لگانا ہے جس کے باعث تار میں لرزش ہی پیدا نہیں ہوتی سُر کی صدا بھی نکلتی ہے۔ ذکر مضراب ہے، دل بجائے تار اور ان کے ملاپ سے جنم لینے والی صدا خیال۔ خیال، ذکر و مراقبہ کا مدّعا، انبساطِ قلب کا ذریعہ اور اللہ کی جانب لے جانے کا وسیلہ ہے۔ گویا خیال کی طہارت اور نگرانی ہی تصوف ہے۔ مولانا رومؒ کی عظیم شعری تصنیف 'مثنوی معنوی' کا آغاز اسی لطیف احساس سے ہوتا ہے۔

؎ بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

''بانسری کی صدا اس شکوہ سے بھری ہوئی ہے جو فراق کی داستان سے
عبارت ہے۔''

ے خشک مغز و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست

''تار، لکڑی اور کھال جو آلاتِ موسیقی بنانے میں استعمال ہوتے ہیں
جب کسی ساز کی صورت اختیار کرلیں تو آوازِ دوست نکلتی ہے۔''

اس شعر میں رومیؒ ذکر، قلب اور خیال کی بات عمیق سطح پر فرماتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ موسیقی کی اصطلاح میں ''خیال'' اصیل گائیکی ہے۔ یعنی ایسی غنا جس میں الفاظ کی ضرورت باقی نہ رہے اور ہر قسم کا اظہار سُروں کے ذریعے مخاطب تک پوری طرح پہنچ جائے۔ تصوف میں ''خیال'' سے مراد وہ رو ہے جو برق سے زیادہ تیز رفتار ہو اور شیخ سے سالک کے رابطے کو جوڑنے میں دیر نہ لگائے۔ علاوہ ازیں خیال کی اصطلاح دھیان اور معرفت کے لیے بھی مستعمل ہے۔ افصح الاولیاء حضرت عبدالکریم جیلانیؒ فرماتے ہیں:

ان الخیال حیات روح العالم
ھو اصل تیك و صلہ ابن الآدم
یس الوجود سوی خیال عند من
یدری الخیال بقدرہ اطمتعاظم

''خیال روحِ عالم کی حیات ہے۔ وہ ان کی اصل ہے اور اس کی اصل ابنِ آدم ہے۔ جو شخص خیال کی حقیقت کو قدرتِ عظیم جانتا ہے اس کے لیے وجود سوائے خیال کے اور کچھ نہیں۔''

پس معلوم ہوا کہ خیال، تصور نہیں بلکہ حقیقت کا اصل ہے جو مادی وجود نہ رکھنے کے باوجود نفسی اور نوری حیثیت سے سراسر موجود ہے۔ مادہ آلائشوں سے پُر اور

کثیف ہے۔ ہر مادی شے کثافت سے بھری ہے مگر خیال غیر مادہ ہونے کے باعث کثیف نہیں، انتہائی لطیف جوہر ہے جو گراں نہیں گزرتا۔ دراصل خیال ہی زندگی کی حقیقت ہے۔

؎ زندگی تے موت جوگی دونویں کوئی چیز نئیں
خیال نال موت اے خیال نال زندگی

فکر، الجواد، الغنی اور القوی سے رزق لیتی ہے اور وارِدِ کتب ہے کہ صرف فکرِ محمدی ﷺ کو پروردگارِ عالمین نے اپنے اسم ''ھادی رشید'' سے خلق فرمایا۔ بعدازاں اس پر ''المیتُ المُعید'' سے جلا کی اور پھر اسے ''باعث شہید'' سے دیکھا۔ جب تمام اسماء کے اسرار یکجا ہوئے تو فکر نے صفاتِ عالیہ کے ساتھ عالم میں ظہور کیا۔ خیال فکرِ محمدی ﷺ ہی کا ایک حصہ ہے جسے اسمائے الٰہی سے اُجاگر کر کے ابدی روشنیاں عطا کی گئیں۔ صاحبِ 'انسانِ کامل' فرماتے ہیں:

''ربِ کائنات نے تمام زمینوں، آسمانوں اور فرشتوں کی ارواح فکرِ محمدیؐ سے خلق کیں اور مختلف مقامات پر ہر قسم کے امور ان کو سونپ دیے۔''

راقم کا مشاہدہ ہے کہ ہر زمانے میں تابعینِ عقل اس صفائی باطن سے محروم رہے ہیں جو اہلِ یقین کو نصیب ہوئی لہٰذا امورِ نفسیہ ہمیشہ معقول گروہ سے بعید رہے ہیں۔ فقیر کے خیال میں عقلیت پسند ایمانِ اصلی سے عدم آگہی کے باعث محض عقل پر تکیہ کر لیتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ اصل اصول کیا ہے جب کہ مراتبِ جنت اور عنایاتِ ربانی اسوۂ محمدی ﷺ کا اتباع کرنے والے عشاق ہی کی وراثت ہیں۔ بقول حافظ شیرازی:

ع اربابِ خرد ذوقِ مےٗ عشق چہ دانند
''عقل والے، شرابِ عشق کا ذائقہ کیا جانیں۔''

نفسِ باطلہ کو شکست دے کر معبودِ حقیقی کی جانب لوٹنا صوفی مومن کی حقیقی منزل ہے۔ سخاوت، پاکیزگی، مجاہدہ، خلوت، جہد فی سبیل اللہ، عدل فی الرعایہ اور اللہ کو پانے کے لیے بوقتِ ضرورت ارضی رشتوں سے جدائی وہ نشانیاں ہیں جو ولی کامل سے ملزوم ہیں۔ یہی صفات ہیں جو ایک مومن کو درجۂ ولایت پر فائز کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اللہ کریم نے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے وارثانِ حقیقی اولیائے عظامؒ کو ان صفاتِ جمیلہ اور اوصافِ کریمہ کا مرقع بنا کر دنیا کی پیشوائی کا فریضہ سونپا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وجعلنا منھم ائمة یھدون بامرنا (السجدہ۔۲۴)

"اور ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو (سیدھی) راہ پر بلاتے تھے ہمارے حکم سے۔"

تصوف عشقِ الٰہی بھی ہے اور اظہارِ عبدیت بھی۔ طلبِ صادق میں سالک اس حد تک آلائشوں سے مبرا ہو جاتا ہے کہ اُسے خواہشاتِ رذیلہ کا خیال تک نہیں رہتا۔ "رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی" والا مصرع پورے سیاق و سباق کے ساتھ سالک پر چسپاں ہو جاتا ہے۔ "تن میرا کل چشماں تھیوے" کی مجازی تفسیر عرب کے معروف عاشق قیس المعروف مجنوں کی زندگی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت امام حسنؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ امام حسنؓ ہی نے ایک بار اس کی ازخودرفتگی دیکھ کر فرمایا تھا "انت مجنون" یعنی تو مجنوں ہے۔ اسی باعث وہ مجنوں کے نام سے مشہور ہوا اور لوگ اس کا اصلی نام تک بھول گئے۔

مجنوں کی مذکورہ کیفیت اتصال کی نہیں بلکہ فنافی المقصود کی تھی اور فقیر اس کیفیت کو داخلِ تصوف نہیں سمجھتا تاہم خیال کرتا ہے کہ اگر اس جوہر کے حامل کا قلب واقعی

رواں ہو جائے تو وہ بہت جلد منازلِ سلوک طے کر لیتا ہے۔ فقیر ان صوفیائے کرام سے متفق نہیں جو اس طرح کے خیالِ مجازی کو لازمۂ تصوف سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک اتنا کمال بھی مجنوں کو اس لیے نصیب ہوا کہ اس کی والدہ حضرت امام حسنؓ کے دولت کدۂ تطہیر میں خدمت پر مامور تھیں۔ سادات عظام کسی کا حق اپنے پاس نہیں رکھتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اہلِ بیت کے ادنیٰ خدام بھی ایسی شان کے حامل رہے کہ سلاطین جن کے کفش بردار ہونے اور ان کے پاپوش آنکھوں سے لگانے پر فخر کرتے تھے۔ اگر قیس میں بذاتہٖ کوئی جوہر ہوتا تو وہ درجہ میں کہیں بلند ہوتا۔

ایک سچے عاشق کا مرتبہ تو یہ ہونا چاہیے کہ اس کی رضا محبوب کی رضا بن جائے۔ عشاق اصول سے سرِ موانحراف نہیں کرتے۔ ان کا دل ایک ہی سمت میں مرتکز ہوتا ہے۔ ظاہر بینوں کی نگاہ میں جو معاملات یکسر اہمیت نہیں رکھتے وہی اہلِ دل کے لیے وجد کا سامان بن جاتے ہیں۔ انھیں ہر مخلوق کا حال یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ خود اسی نوع سے متعلق ہوں۔ قلبِ ماہیت محض فعل نہیں "من تو شدم تو من شدی" کا معاملہ ہے۔ تاہم حقیقت فی نفسہٖ تبدیل نہیں ہوتی بلکہ محدود مدت کے لیے عارضی طور پر منعکس ہوتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جبریلِ امینؑ حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں تشریف لاتے تھے لیکن نہ تو جبریلؑ حقیقی طور پر حضرت دحیہؓ ہوئے اور نہ مذکورہ صحابیؓ درحقیقت جبریلؑ ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ حقیقت اصل کو برقرار رکھتے ہوئے وقتی طور پر اپنا انعکاس کرتی ہے۔ اس عمل سے جوہر کو کچھ فرق نہیں پڑتا تاہم ظرف اور ظروف ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ پانی، پانی ہی رہتا ہے لیکن گھڑوں اور صراحیوں کی خشکی، تری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

درجاتِ عالیہ پر فائز عشاق کے قلوب، برعکس ان کے جن کی بابت قرآنِ کریم

ختم اللہ علی قلوبھم کا امر صادر کرتا ہے، اجر دو برھنہ یعنی شفاف اور آلائشوں سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ 'ھوالظاہر' اور 'ھوالباطن' دونوں کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے اور انوارات کی معرفت کے تمنائی رہتے ہیں جو ربِّ کریم نے اپنے مومن بندوں کے لیے مخصوص کررکھی ہیں۔ وہ رحمتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ یوں کرتے ہیں کہ قولِ الٰہی و رحمتی وسعت کل شیء (میری رحمت ہر چیز میں شامل ہے) پوری طرح اپنی تجلّی کرتا ہے۔

جدید عہد میں تصوف کی تصویر کشی کچھ یوں کی جاتی ہے کہ مذہب اور معاشرے سے اس کی دوری باقاعدہ صفت محسوس ہوتی ہے حالانکہ رسولِ کریمؐ کا واضح ارشادِ پاک ہے:

لا رھبانیہ فی الاسلام (مشکوٰۃ شریف۔شرح السنۃ)

''اسلام میں رہبانیت (ترکِ دنیا) نہیں ہے۔''

'فوائدالفواد' میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ایک قول درج ہے:

''ترکِ دنیا یہ نہیں ہے کہ کوئی خود کو عریاں کرلے مثلاً ہندوؤں کی طرح لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ یہ ہے کہ لباس پہنے، کھانا کھائے اور جو اس کے پاس آئے اسے قبول کرے۔''

تصوف دین اور دنیا کے درمیان توازن کا نام ہے۔ تصوف کا مدعا تعمیرِ سیرت و کردار، شخصیت سازی اور انسانوں کے مابین محبت، یگانگت اور خیر کا فروغ ہے تاکہ وہ دامنِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ ہوکر ایک دوسرے کے ساتھ اپنے معاملات بہتر سے بہتر کرسکیں۔ اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ کریمہ طریقت کے بنیادی اصول اور سب کا بھلا سب کی خیر تطہیر کا بنیادی فلسفہ ہے۔ سالک جب اپنا ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دیتا ہے تو

پہلا درس یہی ہوتا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ حُسنِ سلوک روا رکھا جائے اور اعمالِ صالحہ کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا جائے۔ اگر حُسنِ اخلاق کے ساتھ حُسنِ عمل نہیں تو بیعت کارِ زیاں اور تضیعِ اوقات ہے۔ دنیا کھیتی ہے اور نیک اعمال مثلِ بیج، جن کا پھل ہمیں آگے عطا ہوگا یہاں تک کہ میٹھا بول بھی اعمالِ صالحہ میں شمار ہوتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

قول معروف و مغفرة خير من صدقة يتبعها اذى (البقرۃ۔۲۶۳)

"خوش کلامی اور درگزر اس خیرات سے بہتر ہیں جس کے بعد ایذا دی جائے۔"

سرکارِ دو عالم ﷺ نے بھی اخلاق پر بہت زور دیا اور خود کو اخلاق کی تکمیل کرنے والا فرمایا۔ گویا حیاتِ انسانی میں اخلاقِ نبویؐ کی ترویج اور تربیت تصوف کے عملی فرائض میں شامل ہے۔ حضرت ابوالحسن نوریؒ کے مطابق:

"تصوف نہ رسم ہے نہ علم بلکہ سراسر اخلاق ہے۔ یعنی اگر لگا بندھا طریقہ ہوتا، کوشش سے حاصل ہو جاتا۔ اگر علم ہوتا، پڑھنے سے حاصل ہو جاتا۔ یہ تو اخلاق ہے کہ اپنے میں اخلاقِ الٰہی پیدا کرو۔"

اور یہ اخلاق پیدا ہوتا ہے اطمینانِ قلب سے۔ شرک، حسد، شک اور خواہشاتِ رذیلہ کے اتباع کو قرآنِ حکیم میں امراضِ قلب قرار دیا گیا ہے۔ ان ایمان لیوا بیماریوں سے ممکنہ بچاؤ اور صحت یابی کے لیے غذائے قلب کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ لہٰذا قلبِ سقیم کو قلبِ سلیم میں تبدیل کرنے کی جہدِ مسلسل اور نفسِ مطمئنہ کے حصول کو ممکن بناتے ہوئے نفسِ راضیہ کی منزل تک رسائی سالک کی اولین ترجیح ہونی چاہیے تاکہ وہ ارجعی الی ربك راضية مرضية (اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ الفجر، ۲۸) کے تحت شاد کام ہو اور خاتمہ بالخیر کا حزاوار ٹھہرے۔

اس حوالے سے ایک آفاقی نسخے کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد۔۲۸)

''یاد رکھو، دلوں کا سکون تو اللہ کے ذکر میں ہے۔''

گویا ذکر اللہ ہی اطمینانِ قلب حاصل کرنے کا سیدھا، واحد اور سہل راستہ ہے۔ یہ ایسی نعمت ہے جس سے روح شفاف اور باطن کا غبار صاف ہو جاتا ہے، آئینۂ دل چمکنے لگتا ہے اور سالک اس میں انوارِ الٰہی کے کرشمے دیکھتا ہے۔ اس لیے مومنین کو حکم دیا گیا ہے:

یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا (الاحزاب۔۴۱)

''اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔''

ذکر سے دوری نافرمانی کی طرف لے جاتی ہے اور نافرمانی ابلیس کا راستہ ہے۔ اسی لیے نبیٔ اکرم ﷺ کا ارشادِ پاک ہے:

ما احب اللہ من عصاہ

''نافرمانی کرنے والا اللہ سے محبت نہیں کرتا۔''

جسمِ انسانی معجزۂ الٰہی ہے۔ اس میں جہاں ظاہری حواس کے لیے مختلف اعضاء ہیں وہاں روح کے حواس بھی ہیں جنہیں مقاماتِ نور یا لطائف کہا جاتا ہے۔ گرانقدر کتبِ تصوف میں دس لطائف کا ذکر ملتا ہے جو اپنے اپنے مقام پر عرش سے ورا ہیں۔ جب سالک اپنے شیخ کی صحبت میں پاکیزگیٔ ذات اور بالیدگیٔ نفس سے بہرہ ور ہوتا ہے تو لطائف کی تکمیل کے بعد سیرِ روحانی کا آغاز ہو جاتا ہے اور سالک عالمِ امر کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اکابر صوفیاء و علماء نے انسانی جسم و روح کے جن دس اجزاء کا ذکر کیا ہے ان میں

سے پانچ عالمِ خلق اور پانچ عالمِ امر سے متعلق ہیں۔ بعض کے نزدیک یہی دس اجزاء بحیثیتِ مجموعی لطائفِ عشرہ کہلاتے ہیں۔ عالمِ امر اور عالمِ خلق کے لطائف کا مختصر اور جامع بیان کتابِ مبین میں یوں ہوا ہے:

الله نور السموت والارض (النور۔۳۵)

''اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔''

سماء عالمِ امر اور ارض عالمِ خلق ہے۔ گویا گم گشتہ روحانیت کے حصول کے بعد وجودِ محض کو زائل کر دیا جائے تو ایک لطیف تعلق عالمِ امر سے قائم ہو جاتا ہے اور مظاہرات وعجائبات کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔

قرآن وحدیث لطائف کے ذکر سے معمور ہیں اور وحی والہام کی طرح یہ بھی نور کی طرف سمت نمائی کرتے ہیں۔ حضرت ابو مخذورہؓ کے بارے میں ابنِ ماجہ کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے آپؓ کی پیشانی پر دستِ مبارک رکھا پھر چہرے پر پھیرا اور سینے سے ناف تک لے گئے۔ بعد ازاں آپؐ نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔ گویا یہ واضح ہوا کہ لطائف برحق بھی ہیں اور سنت بھی۔

لطائف کی تابندگی تک کا مرحلہ تصوف اور مراقبات کا سفر سلوک کہلاتا ہے۔ اس دوران ایک سالک کی روح جن عالمین کا سفر طے کرتی ہے، اس کا مختصر تذکرہ یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا:

عالمِ ناسوت: یعنی عالمِ خلق، سلوک کی وہ ابتدائی منزل جسے عالمِ اجسام و محسوسات سے واسطہ ہوتا ہے۔

عالمِ ملکوت: ارواح اور ملائکہ سے متعلق ہفت افلاک پر مشتمل سفرِ سلوک کا دوسرا حصہ جہاں سالک مرتبۂ اخلاص پر پہنچتا ہے۔

عالمِ جبروت: راہ سلوک کا تیسرا مرحلہ جو نو عرشوں کو محیط ہے۔ یہاں آزمائش کے بعد سالک اگلی اور آخری منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے۔

عالمِ لاہوت: روحانی مسافت کا وہ اعلیٰ مقام جسے لامکاں اور عالمِ امر بھی کہتے ہیں۔ اس لامحدود منزل پر سالک تجلیٔ ذات سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

اس کے بعد روح ارفع ترین منازل کے سفر پر روانہ ہوتی ہے اور اس کی انتہا پہ سالک ذاتِ باری سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ فقیر کو اگرچہ اس کے شیخ یہ تمام لطائف و مراقبات کروا چکے تھے لیکن فرشی و عرشی مسافت سے قبل نبیٔ کریم ﷺ نے بار دگر لطائف و مراقبات پر خصوصی توجہ فرماتے ہوئے حکم دیا کہ ان لطائف کو قرآن مجید میں تحقیق کرو۔ خوش قسمتی سے سورہ ق، سورہ بنی اسرائیل، سورہ طٰہٰ، سورہ اعراف اور سورہ الشمس کی آیات مبارکہ ذہن میں تھیں سو آقائے دو جہاںؐ کی خدمت میں تلاوت کیں۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

ان فی ذلک لذکری لمن کان له قلب (ق۔۳۷)

"بے شک اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہے۔"

گویا قلب ذکرِ باری تعالیٰ کا مرکزِ صفات ہے۔ اس کی تطہیر ازحد لازم ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر اللہ کی ضرب غیر اللہ کا نقش مٹا کر توحید قائم کرتی ہے۔ یوں قرآن نے لطیفۂ قلب کھول کر بیان کر دیا۔

لطیفۂ روح کے بارے میں قرآن مجید صریح بیان کرتا ہے کہ اللہ کا امر ہی روح کو استوار کرنے والا ہے۔

قل الروح من امر ربی (بنی اسرائیل۔۸۵)

''(آپؐ) کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کا ایک امر ہے۔''

یہاں روح بطور لطیفہ بیان ہوئی ہے جو اپنی بنیاد میں حکمِ ربانی کے تابع ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فانه یعلم السر واخفی (طٰہٰ۔۷)

''وہ چپکے سے کہی ہوئی بات اور نہایت پوشیدہ بھید تک کو جانتا ہے۔''

لطیفۂ سری اور لطیفۂ اخفیٰ کے مقامات انسانی سینے کے بائیں اور وسط میں ہیں اور ظن و گمان اور غائب و ناموجود کو منسوخ کر کے اعتبار و یقین اور شاہد و ظاہر کو تابندگی عطا کرتے ہیں۔ اسی طرح لطیفۂ خفی کا بیان قرآن میں یوں ہوا ہے:

ادعو ربکم تضرعا وخفیة (الاعراف۔۵۵)

''اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو۔''

یہ لطیفہ سینے کے دائیں جانب مقام رکھتا ہے اور خبائث و رذائل کو رفع کرتا ہے۔ فقیر نے اس لطیفے میں بغض و حسد کو خوار دیکھا۔

عالمِ امر کے مندرجہ بالا لطائف کے علاوہ عالمِ خلق کے لطائفِ خمسہ بھی ہیں۔ ان میں سے ایک ونفس وما سواها (الشمس۔۷) کے تحت لطیفۂ نفس ہے جو پیشانی سے دماغ اور ناف تک مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ علمائے متقدر اس کے رقبے پر متفق نہیں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ یہ لطیفہ عاجزی، حلم اور مناجات کے لیے اکسیر ہے۔ فقیر نے لطیفۂ قالبیہ (سلطان الاذکار) میں عناصرِ اربع یعنی آب و باد و خاک و نار کو یکجا دیکھا۔ پورا جسم اس کا مقام ہے اور اثر میں ایسا کہ اسمِ ''اللہ'' ہر بن مو سے چھلکنے لگتا اور انسان سراپا ذکر بن جاتا ہے۔ یہ لطیفہ علائقِ دنیا اور شکم پروری کا ناسخ ہے۔

شیخ کو چاہیے کہ سالک کو مراحل طے کرانے میں بہت احتیاط سے کام لے، بہرگام اس کے ہر قول و فعل کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس کی کیفیت پر آنچ نہ آنے دے اور اس کی روحانی ترقی کو اپنی کامیابی سمجھے۔ اور سالک کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہر آن گفتۂ شیخ پر یقین رکھے، اس کی فرماں برداری کو فرض مانتے ہوئے اپنے ارادے اور مرضی سے دست کش ہو کر تعمیلِ ارشاد کے لیے ہمہ وقت تیار رہے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا یہ فرمان ذہن نشین کر لے:

> ''جس شخص نے شیخ کے جواب کا احترام ملحوظ نہ رکھا، وہ شیخ کے فیض سے محروم ہو گیا، اور جس نے شیخ کی بات کے جواب میں ''نہیں'' کہہ دیا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔'' (عوارف المعارف)

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک سچے سالک کے برعکس دنیا دار کا اعتقاد بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ بغیر کسی امتحان سے گزرے من کی مرادیں پالے۔ جہاں شیخ نے کٹھالی میں ڈالنے کی کوشش کی، سود و زیاں کے گوشوارے مرتب کرتے ہوئے جھٹ سے رستہ تبدیل کر لیا۔ اکابر اولیائے کرام اس امر پہ متفق ہیں کہ ایک بار شیخ کی توجہ اور دھیان سے دور ہونے والا دین کے ساتھ ساتھ دنیا سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ جادۂ عشق میں ادب، عقیدت اور اطاعت کے بغیر استفادہ ممکن ہی نہیں۔ بعض اوقات برسوں کی مسافت کے باوصف طلب اور خواہشات میں تغیر رشتوں کے انقطاع کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے سمت کا تعین اور ارتکاز ہمیشہ سالک کے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ مسافتِ عشق 'دو چار دن کی بات نہیں، عمر بھر کی بات' والا معاملہ اور ہر گھڑی سرانجام دی جانے والی سرگرمی ہے۔ اس سفر میں کامیاب وہی گردانا جاتا ہے جو خاتمہ بالخیر کا جز اوار ٹھہرے۔ یعنی:

ے پانی بھرن سہیلیاں رنگا رنگ گھڑے

بھریا اس دا جانڑیے جس دا توڑ چڑھے

ایک سچے طالب کا کردار کسی مبتدی کے مقابلہ میں زیادہ ذمہ دارانہ ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے مشکل بھی ہے۔ سو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جس قدر بھی بلند پرواز کیوں نہ ہو اس کی ڈور مرشد کے ہاتھ میں ہی رہتی ہے، وہ چاہے اُسے آسمانوں پہ اڑاتا پھرے چاہے تو کھینچ کے زمین پر لے آئے۔ شیخ کی توجہ اگرچہ تمام سالکین پر یکساں ہوتی ہے مگر صحبتِ شیخ میں کمی بیشی کیفیات میں اتار چڑھاؤ کا باعث بن جاتی ہے۔ اخذِ فیض کے لیے طالب کا محض آرزومند اور متوجہ ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اعمال کے ذریعے طلبِ صادق اور استعداد کا اظہار بھی ضروری ہے۔ جس نسبت سے سالک کی طلب بڑھے گی اسی تناسب سے شیخ کی توجہ اور عطا میں اضافہ ہوگا اور طالب کے دل میں جذب وانجذاب کی صلاحیت بڑھ جائے گی۔ توجہ انعکاسی، توجہ القائی اور توجہ اتحادی توجہ کے مختلف درجے ہیں لیکن ان میں توجہ اتحادی سب سے زیادہ قوی، فائق اور پائیدار ہے۔ اس میں شیخ بھرپور انہماک سے اپنے روحانی کمالات طالب کی روح میں القاء کر دیتا ہے۔ یوں دونوں روحیں باہم جذب ہو جاتی ہیں اور من وتو کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس دورِ پُرفتن میں جہاں یہ توجہ دینے والے خال خال نظر آتے ہیں وہاں ایسے سچے طالب اور حقیقی ظرف والے بھی کم کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ الحمدللہ فقیر کو اس کے شیخ نے ایک خاص اور یادگار ملاقات میں سینے سے لگا کر تمام حجابات اٹھاتے ہوئے فرمایا:

''یاد رکھنا میں نے تمہیں توجہ اتحادی سے نوازا ہے۔''

آپؒ طبعاً سخی تھے اس لیے اکثر ساتھی ابتداً فیض یاب تو ہوئے لیکن بہت کم گرہم

رفتار نکلے اور استقامت بھی چند ایک خوش نصیبوں کے حصے میں ہی آئی۔ شوق کے ساتھ اگر عمل میں ثبات نہ ہو تو تصوف، روحانیت نہیں محض دکھاوا ہے۔

اگر لطائف جاری ہو جائیں تو سستی اور کاہلی نہیں رہتی۔ سو ایک سالک کو ذکرِ الٰہی کے حوالے سے غفلت اور کوتاہی کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے۔ فقیر کو حضورؐ نے خلفائے راشدینؓ، حسنین کریمینؓ اور اکابر اولیائے کرامؒ کی موجودگی میں تمام لطائف اس سبک رفتاری سے طے کرائے کہ پلک جھپکنا بھی ایک بات سی لگتی ہے۔ ذکرِ اسمِ ذات، لطائف، مراقبات اور منازلِ سلوک کا بنیادی مقصد نفسِ امارہ کو نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنہ میں تبدیل کرتے ہوئے نفسِ راضیہ کی منزل تک رسائی ہے۔ یہ جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے کی منزل اور ہر حال میں راضی بہ رضا رہنے کا مقام ہے۔

فقیر محسوس کرتا ہے کہ اہلِ خرقہ نے لطائف کو معمول کی حیثیت دے دی ہے حالانکہ سالک کی لیاقت ملاحظہ کیے بغیر یہ موتی لٹانا مناسب نہیں اور سالک کو بھی محض لچھے دار باتوں اور کھوکھلے دعووں سے خوش ہونے کی بجائے اپنی مسافتِ سلوک کا خود شاہد ہونا چاہیے۔ بقول حضرت اللہ یار خانؒ:

> ''صرف زبانی جمع خرچ کافی نہیں کہ پیر صاحب فرما دیں کہ لو تمھیں دربارِ نبویؐ میں پہنچا دیا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سالک خود مشاہدہ کرے کہ منازلِ سُلوک طے کر رہا ہے۔'' (دلائل السلوک)

مشاہدے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے مقامات کو دیکھے اور دوسری یہ کہ شیخ کی کہی گئی بات کو اپنے اندر اترتے ہوئے محسوس کرے۔ الحمدللہ راقم کے پاس متعدد ایسے حضرات آئے جنھوں نے جاگتی آنکھوں لطائف و مراقبات کے بعد دربارِ اقدسؐ میں باریابی کی گواہی دی اور کئی ایک نے اپنے اندر پاکیزگی کے بڑھتے

ہوئے احساسات اور اپنی اُجلی کیفیات کے ذریعے اس مبارک سفر کی شہادت دی۔

لطائف کی تابانی سچّی طلب اور اطاعت سے مشروط ہے تاہم طلب، توفیق اور عطا کا معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ جو شیخ اس نکتے کو عملی سطح پر تابندہ کر دے وہی عارفِ کامل ہے۔ اگرچہ رویتِ اشکال اور کشف و کرامات وغیرہ صحیح اسلامی تصوف کا مقصود نہیں پھر بھی کبھی کبھار اس راستے کے مسافر کو یہ نعمتیں ضمناً عطا ہو جاتی ہیں لیکن یاد رہے کہ راہِ سلوک میں مقصود بالذات صرف اور صرف حصولِ رضائے الٰہی اور عشقِ حبیبِ خدا ﷺ ہے۔ فقیر کو ہر لطیفے کی خصوصیت، رقبہ اور اثر و رنگ کے متعلق تفصیلاً آگاہ کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا..... ''بیٹے لطائف مراحلِ عشق ہیں جب کہ آپ کو بہت آگے جانا ہے۔'' الحمد للہ، فقیر نفسِ راضیہ کی آخری حد تک ہو آیا جہاں منشاء صرف حق ہے اور اسی کی حکمرانی عالمین کو محیط ہے۔ سالکین ہمیشہ یاد رکھیں کہ لطائف کا روشن ہونا ایک چراغ کی مانند ہے جو راہ سجھائے، یہ تصوف کا مقصود نہیں۔ دورانِ ذکر رنگوں کا مشاہدہ بعض حضرات کے لیے بڑی بات سہی لیکن سچا عارف اسے معمولی خیال کرتا ہے کیونکہ مقصدِ عینی وصلِ ذاتِ حق ہے۔ انسان کا سب سے بڑا ارمان ہی یہ ہے کہ وہ ہجر کی طویل شاہراہ طے کر کے دائمی وصل پا لے گویا لطائف و مراقبات وسیلہ ہیں طلب نہیں۔ فقیر کے نزدیک تصوف کا بنیادی مقصد حُبِ رسول ﷺ ہے جو حُبِ الٰہی کی جانب لے جاتی ہے۔ بخاری و مسلم شریف کی زینت یہ حدیثِ مبارکہ دراصل تصوف کا متن ہے۔

لا یومن احدحتی کم اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک

اس کے دل میں میری محبت اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔"

بے شک نبی کریم ﷺ کی محبت ہی سالک کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ وہ جب تک ہر شے کی محبت سے بے نیاز ہو کر آپ ﷺ کے عشق کا اسیر نہ ہو جائے، اسے کامل مومن و سالک نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ راقم ان صاحبان سے متفق نہیں جو تصوف کی جڑیں یونانی اور ہندی تہذیب میں تلاش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اقبالؒ کا فرمان سند کا درجہ رکھتا ہے:

بہ مُصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

یعنی خود کو حضور ﷺ کے دربار میں لے جا کہ وہی دین کی تفسیر اور مکمل دین ہیں بصورتِ دیگر تو وہاں نہ پہنچا تو بولہبی میں گھر جائے گا۔

ممتاز محقق اور صحیح اسلامی تصوف کے شارح ڈاکٹر زرّیں کوب نے اپنی کتاب 'ارزشِ میراثِ صوفیہ' میں ان مستشرقین کو مدلّل جوابات دیئے ہیں جو اسلامی تصوف کو کبھی مجوسیت سے ماخوذ بتاتے ہیں اور کبھی ہندومت سے۔ آپ لکھتے ہیں:

"...... اسلامی تصوف غیر اسلامی مذاہب سے اس نوعیت کی شباہت کے باوجود نہ جزوی طور پر ان مذاہب سے برآمد ہوا نہ مجموعی اعتبار سے ان سے برآمد ہوا بلکہ اپنی ذات میں ایک مستقل شے ہے جس کا مخرج اسلام اور قرآن ہے اور اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں کہ بجز اسلام اور قرآنِ حکیم کے تصوف کے عناصر غیر اسلامی ہو ہی نہیں سکتے۔ (اس بحث سے) یہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور عہدِ حاضر میں یہی نظریہ بیشتر اہلِ تحقیق نے تسلیم کیا ہے۔"

بات دراصل یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیشوا اپنی کتابوں میں نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں موجود پیش گوئیاں دیکھ کر جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ان کے پاس کلامِ الٰہی کی تردید کا تو کوئی ثبوت نہیں ہوتا لیکن اپنی جلن مٹانے کے لیے انھیں بار بار صوفیاء کا انکار کرنا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دائرہ اسلام میں الحمدللہ ایسے اذہان موجود رہے ہیں جو ان فتنہ پردازوں کے ہاتھ اور زبان روکنے کے لیے کافی ہیں۔ ماضی قریب میں حضرت مہر علی شاہؒ، حضرت مولانا اللہ یار خانؒ اور حضرت باغ حسین کمالؒ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے تحریری اور تقریری ہر دو سطحوں پر منفرد کام کیا جبکہ ان حضرات سے پہلے اور بعد میں بھی اس میدان میں کام کرنے والوں کی کمی نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب 'ہمعات' میں کئی مقامات پر تصوف اور اہلِ تصوف کی اسلامی حیثیت واہمیت واضح کی ہے۔فرماتے ہیں:

> ''جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا تو آپؐ سے حفاظتِ دین کا جو وعدہ کیا گیا تھا، آپ ﷺ کی وفات کے بعد اس وعدہ کی حفاظت کی دو شکلیں پیدا ہوئیں۔ وہ بزرگ جن کو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت کی حفاظت کی استعداد ملی تھی وہ تو دین کی ظاہری حیثیت کے محافظ بنے۔ یہ فقہا، محدثین، نمازیوں اور قاریوں کی جماعت ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں اہلِ ہمت کی یہ جماعت مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ دین کی تحریف کی اگر کہیں کوشش ہو تو یہ لوگ اس کی تردید میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دین کا دوسرا گروہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے باطنِ دین، جس کا دوسرا نام ''احسان'' ہے، کی استعداد عطا فرمائی۔ ہر زمانے میں اس

گروہ کے بزرگ عوام الناس کا مرجع رہے ہیں۔ طاعت و نیکوکاری
کے اعمال سے باطنِ نفس میں جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور
دلوں کو ان سے جو لذّت ملتی ہے، یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت
دیتے ہیں نیز یہ انھیں نیک اخلاق اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔"
(ہمعات، ص ۴۵۔۴۴)

حضرت باغ حسین کمالؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "حالِ سفر" صفحہ ۵۵ میں
رقم طراز ہیں:

"...... گویا آنحضورﷺ نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دو انداز
اختیار فرمائے۔ ایک علمی و ذہنی اور دوسرا روحانی و قلبی۔ پہلے طریقے سے
آپﷺ نے قرآنِ کریم کی آیات و احکام اور دیگر اصولِ حیات و حکمت
سکھائے۔ اور دوسرے طریقے سے اپنی نگاہِ کیمیا اثر کے فیض سے ایمان
لانے والوں کے شیشہ ہائے قلوب سے قبل از اسلام گناہوں اور غیر اللہ
کی محبت کی تمام تر کثافت اور زنگ اتار کر اللہ کریم کے لیے شدید محبت کا
رنگ اجاگر فرما دیا۔ پہلا طریقہ زبان و بیان سے متعلق اور دوسرا طریقہ
القائی و انعکاسی اثرات کا حامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی کوئی شخص ایمان
لانے کی غرض سے آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، اسکے قلب پر
ایک نگاہِ معجزاثر پڑی اور وہ نفس کی تمام تر آلائشوں اور وساوسِ شیطانی سے
پاک صاف ہو گیا۔۔۔ صحابی بن گیا۔"

مندرجہ بالا آراء کی روشنی میں یہ حقیقت کھلتی ہے کہ دینِ متین کے دو پہلو ہیں۔
پہلے شعبے میں ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات ہیں جو فقہی اصطلاحات اور

اوامر ونواہی پر مشتمل ہیں۔ یہ تعلیماتِ نبوی ﷺ کی ظاہری صورت ہے۔ اِسے شریعت کہتے ہیں کہ قرآن، حدیث اور فقہ کے ستونوں پر ایمان، عبادت، اخلاق اور معاملے کو استوار رکھا جائے۔ دوسرا شعبہ طریقتِ محمدی ﷺ نعمتوں، برکتوں اور تحفوں کا شعبہ ہے جس کا مقصود قرآن وحدیث کی روشنی میں روح کو تقویت دینے اور باطن کو طہارت و پاکیزگی کے زیور سے آراستہ کرتے ہوئے ان قلبی کیفیات کا حصول ہے جو نبی کریم ﷺ نے تقسیم فرمائیں اور تا ابد عنایت فرماتے رہیں گے۔ یہ کسی ولی کو خود حضور ﷺ کی بارگاہ سے پہنچتی ہیں اور کسی کو اہلِ برزخ انعام کرتے ہیں۔

یعنی واضح ہو گیا کہ باطنِ دین کی حفاظت اور اس کا فروغ و ترویج اولیائے کرامؒ کے سپرد ہے اور انھیں کچھ ایسے فرائض سونپے گئے ہیں جن کی بجا آوری ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتی۔ برِصغیر کے عظیم ترین صوفی اور علماء کے افتخار حضرت سیّد علی ہجویریؒ اپنی تصنیفِ لطیف 'کشف المحجوب' (ص ۳۶۔۳۵) میں فرماتے ہیں:

''اہلِ تصوف کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو صوفی ہیں اور اپنے معاملات میں ہر اعتبار سے ثقہ اور کامل ہیں۔ یہ صاحبان اپنی ذات میں فانی اور ذاتِ حق میں باقی ہیں۔ یہ صاحبانِ وصول ہیں۔ دوسرے وہ جو متصوف ہیں۔ یہ اپنے مجاہدے سے مراتب حاصل کرتے ہیں اور صاحبانِ وصول کی پیروی کرتے ہیں۔ انھیں صاحبانِ اصول کہیے۔ تیسرے مستصوف ہیں۔ یہ لوگ تصوف کے معاملات میں بالکل کورے اور بہروپیے ہیں۔ نقالی ان کا شیوہ ہے۔ صوفیاء کے نزدیک ان کی حیثیت مکھی کی مانند ہے جو ہر وقت ہوس میں مبتلا رہتی ہے۔ ان کا کام مال و دولت جمع کرنا اور جاہ و منصب حاصل کرنے کی فکر کرنا ہے۔ یہ صاحبانِ فضول ہیں۔''

بدقسمتی سے آج کے دور میں متصوفین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انھیں شمار کرنا امرِ محال ہے۔ داتا صاحبؒ نے نہایت باریکی سے فانی فی اللہ اور باقی باللہ کی دقیق مثال روشن کرتے ہوئے بتایا ہے کہ زندگی کی چمک دمک پر مر مٹنے اور اس کی عارضی رنگینیوں پر نظر رکھنے والے بھلا تصوف کے لازوال رنگوں سے کیونکر فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہر دور میں فانی فی اللہ حضرات کو ہی خلقِ خدا کی تربیت اور اسے صراطِ مستقیم پر لانے کے لیے تصنیفات منظرِ عام پر لانا پڑیں۔

مذہب کا ظاہر اور باطن بے شک الگ الگ طبقوں کے سپرد ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ظاہر و باطن میں دوئی ہے یا ان کی ہم آہنگی محال ہے۔ دینِ اسلام پھول ہے، جبکہ رنگ اس کا ظاہر اور خوشبو اس کا باطن ہے۔ سالک کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مذہب کی باطنی ذمہ داری پوری کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ظاہری اعمال کی عاشقانہ پرورش اور بجا آوری بھی باطنی بالیدگی کا باعث ہے۔ شاید یہی نکتہ تھا جسے سامنے رکھ کر شیخ ریاض الدین سہروردیؒ نے فرمایا:

> ''پھر مذہب کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اس کا ظاہر خلق اللہ کے ساتھ ادب کا استعمال ہے اور اس کا باطن نزولِ احوال اور مقامات کے وقت حق تعالیٰ کی معیت ہے۔ چنانچہ نبی کریمؐ نے ایک شخص کو نماز میں اپنے کپڑوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ کر فرمایا ''اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی خشوع ہوتا۔''
>
> (آداب المریدین ص ۳۱۔۳۰)

مراد یہ کہ خضوع و خشوع کا متحد ہونا لازمی شرط ہے ورنہ عبادت باطل ہو گی۔

اولیاء کے ارشادات کو سمجھنا لازمی ہے ورنہ خطرہ ہے کہ قاری آدھے ادھورے مطلب کو پا کر مفہوم کو خلط ملط کر دے گا اور عمل کی کوتاہی کا مرتکب ٹھہرے گا۔ ان رموز کی پہچان از حد ضروری ہے جو صاحبِ تحریر نے عبارت میں واضح یا پوشیدہ طور پر رکھ دیئے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں حضوری کے لیے عقیدۂ توحید کا صحیح ہونا ایک ایسی شرط ہے جو محض کلمہ پڑھنے سے پوری نہیں ہوتی۔ حضوری کا حصول صرف ایک صورت میں ممکن ہے اور وہ ہے سورۃ اخلاص میں بیان کی گئی صفات پر مکمل ایمان۔ سالک اگر اس سورۃ مبارکہ کا مجسم و مکمل گواہ نہیں تو گویا کچھ نہیں۔ افتخارِ اولیاء حضرت جنید بغدادیؒ کا فرمان ہے:

> ''کمالِ احدیت کے ساتھ اس کی وحدانیت کو جان کر اللہ کو فردِ یکتا جاننا، وہ ایسا ایک ہے جس نے نہ کسی کو جنا نہ خود کسی سے پیدا ہوا۔ اس کا نہ کوئی مقابل ہے نہ کوئی مثل اور نہ ہم شبیہہ...... اس جیسا کوئی نہیں وہ سمیع البصیر ہے۔''
> (رسالہ قشیریہ، ص ۷)

قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونا تصوف کا بہترین عملی اظہار ہے۔ مرشد کا کام ہے کہ سالک میں ''ھل من مزید'' کی صفت اجاگر کرے اور اس راہِ راست کی طرف شوق دلائے جو ''قل ھو اللہ احد'' کی منزل کی نشاندہی کرے۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں انسانی فکر و عمل کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے اور وہ رضائے باری تعالیٰ سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یقین کی اس منزل میں عارضی آسرے ماند پڑ جاتے ہیں اور حقیقی محافظ کا نقشِ جلی نورِ ایمان بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ جب سالک مکمل طور پر Surrender کر دیتا ہے تو ذاتِ الٰہی اس کی نگہبان بن جاتی ہے اور باقی تمام سہارے عارضی، جھوٹے اور کمزور لگنے لگتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ولا یؤدہ حفظھما وھوالعلی العظیم (البقرۃ-۵۵)

"اور اللہ تعالیٰ نہ ان کی حفاظت سے تھکتا ہے اور نہ اکتاتا ہے، وہ تو بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔"

اس کے ساتھ عجز بھی لازمۂ تصوف ہے ورنہ سب کچھ غارت ہو جائے گا۔ فہم ہو کہ عقل، گمان ہو کہ تخیّلِ محض، قیاس ہو کہ ہمارے حواس، سب کچھ عاجز ہے کہ اللہ اکبر کی صفات کا احاطہ کر سکے۔ وہ ذاتِ بے کنار لیس کمثلہ شئی ہے، صورت و ہیئت اور شکل سے مبرّا۔ اس لیے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول ذہن نشین کر لینا چاہیے جسے شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالحق محدثِ دہلویؒ اور امام غزالیؒ جیسے علماء نے نقل کیا ہے:

العجز عن درك الادراك۔۔۔۔۔۔

یعنی عجز ہی درِ ادراک کھولے گا مگر اس طرح کہ علم و ایمان اسے جلا دے اور عشقِ حقیقی اسے رخشندگی عطا کرے۔ پھر معلوم ہوگا کہ مقامِ ذات میں احدیت سے مراد صرف اور صرف ذاتِ حق ہے اور اس کی حقیقت اور منبع علم میں نہیں سما سکتا۔ یہ نکتہ نبی کریمؐ کی حدیثِ مبارکہ سے بھی ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

ما عرفناك حق معرفتك

فکر کی انتہا معرفت ہے مگر یاد رہے کہ الحاد کا شکار اور بے لگام فکر حق کے عرفان کی بجائے گمراہی اور انکار کی جانب لے جاتی ہے۔ دوسری طرف حلال فکر واجب ہے جس کا ذکر اکابر صوفیاء نے کتبِ عالیہ میں کیا ہے۔ فکرِ حلال یہ ہے کہ سالک عظمتِ الٰہی کے باب میں غور کرے اور تدبّر سے کام لے۔ یہ وہ مقام ہے جو سالک کو دنیاوی جھمیلوں سے نکال کر احدیت کے رستے پر لے چلتا ہے، اس کے اندر قدرتِ الٰہی کا

مشاہدہ کرنے کی توفیق نمو پاتی ہے اور وہ انوارات کی توجیہہ عاشقانہ انداز میں کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ بے شک عشق وہ نکات تعلیم کرتا ہے جن تک مکتبی ذہنوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اللہ کے فیصلوں میں کائنات کی تمام مخلوقات کو مدنظر رکھا جاتا ہے لیکن ایک عام آدمی کے پیشِ نظر محض اُس کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے اور اس کی خواہشات اس کی کمزور ذہنی کیفیت کی عکاس ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس امتحان گاہ کے تمام نتائج ہماری مرضی اور آرزو کے موافق ہوں۔ یہ خالقِ دو جہاں کی حکمت و منشا پر منحصر ہے کہ سنگلاخ چٹانوں سے ٹھنڈے میٹھے چشمے جاری کرے یا بے کراں تپتے صحراؤں میں ہرے بھرے نخلستان پیدا کر دے۔ لہٰذا اپنی پسند کو اپنے رب کی پسند کے مطابق ڈھالنے اور اپنی مرضی کو اس کی رضا میں گم کرنے سے ہی انسان حقیقی مسرت اور کامیابی سے آشنا ہوتا ہے۔ گویا حصولِ مقصد کی تگ و دو کے بعد انسان اپنی مساعی کے حوالے سے اللہ پر بھروسہ کر لے تو اس کا اضطراب ایک سکون آور کیفیت میں ڈھل جاتا ہے، یعنی اسبابِ ظاہری استعمال کرتے ہوئے معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے تو اسباب کے پردے میں مسبّب الاسباب کی طرف یہ مراجعت توکّل کہلاتی ہے۔

؎ کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

ہمارا کارساز (اللہ) ہمارے کام کی فکر میں ہے، جب کہ کام میں
ہماری فکر ہمارے آزار کا باعث ہے۔

احدیت پر ایمان کے بعد مومن حقیقتِ محمدی ﷺ تک آتا ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کا اسمِ ثانی ہے کیونکہ آپؐ سید الانبیاء بھی ہیں اور خاتم الانبیاء بھی۔ قرآنِ کریم میں دین کے اکمل ہونے کی خوشخبری اسی پر دلیل ہے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابی امامہؓ سے

مروی وہ احادیث اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچاتی ہیں کہ عقل، نور اور روح سے دراصل عقلِ اول اور حقیقتِ محمدی ﷺ ہی مراد ہے کیونکہ باقی تمام موجودات اسی کے مظاہر ہیں۔ اس نکتے کی تفسیر میں عیاں ہو گا کہ تمام مراتب کی حیثیت عقلِ اوّل یا حقیقتِ محمدی ﷺ کے سامنے ثانوی ہے۔

تصوف سب سے پہلے ذاتِ الٰہی کے عرفان کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی مہرِ اسمِ مبارک دل پر ثبت ہو جائے اور یہ تعلیم دین و ایمان کا حصہ بن جائے کہ شفاعت و سفارش بھی مرضیٔ باری تعالیٰ کے بغیر ممکن نہیں اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب غیر اللہ کا تصور سراسر محو ہو جائے۔ بے شک مرشد چاہے جس مقام اور مرتبے پر فائز کیوں نہ ہو، اللہ کے حکم کے بغیر سفارش نہیں کر سکتا کہ اختیار اسی ذات کو حاصل ہے جو مختارِ کل بھی ہے اور مالک الملک بھی۔ اس لیے ایسے متوسلین جو عمل کے بغیر اس امید پر اپنے شیوخ کی چوکھٹ پر پڑے رہتے ہیں کہ ان کے مرشد انھیں ہر حال میں داخلِ بہشت فرما دیں گے، اپنے عقیدے کی اصلاح کریں۔

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

میرے شیخِ مکرّم حضرت باغ حسین کمالؒ نے ایک بار مجھ سے فرمایا:

"یاد رکھو صرف بیعت کر لینے سے تمہارے ساتھی اس قابل نہیں ہو جائیں گے کہ سلوک و معرفت ان پر سہل ہو جائے۔ انھیں خوفِ الٰہی اور حُبِ رسول ﷺ کا سبق ہر حال میں یاد رکھنا ہے۔"

فقیر اپنے قول کی مکرّر ادائیگی ضروری خیال کرتا ہے کہ سالک اپنے مرشد کی وساطت سے دربارِ نبویؐ میں باریاب ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ،

ذاتِ باری تعالیٰ کے بعد تمام مخلوقات کا سب سے بڑا آسرا ہیں جیسا کہ نبی کریمؐ کا ارشادِ مبارک ہے:

''قیامت کے دن میں وہ پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر شق ہوگی اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جس کو شفاعت کی اجازت ہوگی اور جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپؐ بھی معبودِ حقیقی کے حکم پر سرِ اقدس خم کرنے والے ہیں۔ جب اللہ کے محبوبؐ مرضیٔ حق کے بغیر کوئی قول و فعل سرانجام نہیں دیتے تو عام انسانوں کی کیا مجال۔ لہٰذا سالک کو چاہیے کہ قرآنِ کریم کی یہ آیت دل و جان میں سجالے:

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی (الکہف۔۱۱۰)

''کہہ دیجیے کہ درحقیقت میں بھی ایک بشر ہوں تمہارے جیسا، (فرق یہ ہے کہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''

مذکورہ آیت کے مطابق نبی کریمؐ نے اپنے قول و فعل میں بہرحال حکمِ الٰہی کی متابعت فرمائی اور اپنے آخری امتی تک ہر ایک کو یہ درس دیا کہ جو انسان خود کو امرِ ربانی کے مطابق ڈھال لیتا ہے، اسی پر خوشنودیٔ الٰہی کے در وا ہوتے ہیں۔ اسوۂ محمدیؐ کے پیروکار ہمیشہ شریعت کے پابند رہتے ہیں اور کبھی اس سے تجاوز نہیں کرتے۔ سالک کا ایمان تب ہی کامل ہوگا جب وہ حضورﷺ کو شافع محشر سمجھے لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھے کہ آپﷺ کی شفاعت بھی اللہ کے حکم سے نصیب ہوگی۔ ایک مشرک نے شرکِ کبیر کا ارتکاب کیا یا شرکِ صغیر کا، وہ شرکِ جلی کا مرتکب ہوا یا شرکِ خفی کا، کبھی بہرہ یاب نہیں ہوگا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں بار بار اس گناہِ کبیرہ سے

بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء (النسا۔۴۸)

''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کیے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے۔''

ترمذی شریف کی یہ حدیثِ مبارکہ اسی نکتے کا تسلسل ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ:

''میرے پاس اللہ کا پیغام آیا اور مجھے اللہ نے اختیار دیا کہ اللہ میری آدھی اُمت کو جنت میں داخل کر دے، یا میں شفاعت کروں۔ میں نے شفاعت کو اختیار کیا اور یہ شفاعت ہر اس مسلمان کو حاصل ہوگی جو شرک پر نہیں مرے گا۔''

ایمانِ کامل بخشش و شفاعت کی بنیاد اور لازمی شرط ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

من عمل صالحا من ذکر او انثی و ھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبہ (النحل۔۹۷)

''جو بھی عمل صالح کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت مگر شرط یہ ہے کہ مومن ہو تو ہم اسے حیاتِ طیبہ عطا فرمائیں گے۔''

فقیر اس نکتے کو یوں تمام کرتا ہے کہ بے شک حضورﷺ کی شفاعت اس شخص کو نصیب ہوگی جس نے آپﷺ کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاری اور اللہ کو واقعی ربّ العالمین جانا۔

احکاماتِ خداوندی اور تعلیماتِ نبویؐ کے مطابق زندگی بسر کرنا صوفیاء کا طرۂ امتیاز ہے۔ صحابہ کرامؓ سے تابعین اور پھر تبع تابعین سے اولیائے کرامؒ تک ہر سینہ عشق

کی جوت سے فروزاں دکھائی دیتا ہے۔ ان مبارک ہستیوں کے وجودِ مسعود ہی سے عشق کا معیار، سلوک کا وقار اور تصوف کا اعتبار قائم ہے۔ اس بارے میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے صراحت کے ساتھ ثابت کیا ہے۔

"صوفیائے کرام مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو اتباعِ رسولؐ میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئی ہے کیونکہ انھوں نے آپؐ کے اقوال کی مکمل پیروی کی۔ آپ ﷺ نے جس بات کا حکم دیا انھوں نے اس کی تعمیل کی اور جس بات سے روکا اس سے باز رہے۔"

(عوارف المعارف، ص ۸۲)

الغرض کتبِ تصوف کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ہر دور میں صوفیاء نے حکمِ الٰہی اور فرمانِ رسول ﷺ کی بجا آوری کو اپنا دستور و منشور قرار دیا۔ بقول حضرت سلیمان تونسوی:

"اتباع دو باتوں سے عبارت ہے۔ جس بات کا اللہ تعالیٰ اور رسولِ اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے اس کی بجا آوری کی جائے اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے انھیں نہ کیا جائے۔"

(تاریخِ مشائخِ چشت، ص ۶۴۳)

راقم کے خیال میں تصوف اطاعتِ الٰہی اور پیرویٔ رسولِ کریم ﷺ کے سوا کچھ نہیں۔ درحقیقت اطاعتِ الٰہی اور پیروی رسولِ کریمؐ کی حقیقی سمجھ دائرہ تصوف میں شامل ہوئے بغیر نصیب بھی نہیں ہو سکتی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے نازک سفر میں رہنمائی کے لیے کس کا انتخاب کیا جائے۔ اس حوالے سے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی مشورت بہر حال پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ فرماتے ہیں:

"پیر ایسا ہو جو شریعت، طریقت اور حقیقت کے احکام کو اچھی طرح جانتا

ہو اور جب صورتحال یہ ہو گی تو پیر کسی ایسی بات کا حکم نہ دے گا جو
خلافِ شریعت ہو۔" (فوائد الفواد، ص ۲۵۰)

مندرجہ بالا قول کڑے معیار تجویز کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ قرآنِ کریم کی سمجھ، ارکانِ دین کی بجا آوری، رسولِ کریمؐ کا عشق، آپ ﷺ کی سنت کی پیروی کے ذریعے ربِّ اکبر تک رسائی کی جدوجہد اور مجازی نسبتوں کو ترک کر کے حقیقتِ اولیٰ پر ایمان، دوم نہی عن المنکر یعنی برائی سے رکنا اور روکنا، سچائی کو اس قدر راسخ کر لینا کہ وہ ایمان کا جُزو بن جائے اور غیر اللہ کا شائبہ تک نہ رہے۔ اہلِ سلوک نے مرشدِ کامل کے لیے ایک باقاعدہ معیار مقرر کر کے گروہِ کاملین کو تین درجوں کامل، اکمل اور مکمل میں تقسیم کیا ہے لیکن عام طور پر اکمل اور مکمل کے لیے بھی لفظ کامل ہی مستعمل ہے۔ کامل وہ شخص ہے جو خود تو باطنی کمالات کا حامل ہو لیکن کسی طالب کو فیض یاب نہ کر سکے۔ اکمل اسے کہا جاتا ہے جو خود بھی صاحبِ اسرار ہو اور فیضانِ باطنی و ہدایتِ ظاہری سے دوسروں کو بھی فیض یاب کرے۔ ایسا شخص اول الذکر سے بہتر ہے لیکن اسے مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مکمل اس صاحبِ کمال کو کہا جاتا ہے جو اپنی باطنی توجہ اور روحانی تصرف سے کسی طالب کو چاہے وہ کسی قابل ہو یا نہ ہو، دربارِ اقدسؐ میں پہنچا سکے۔ اس ضمن میں حضرت باغ حسین کمالؒ کا فرمانا ہے:

"اولیائے کرامؒ میں اس شخص کو بھی کامل قرار نہیں دیا جا سکتا جو خود تو وہاں (دربارِ اقدسؐ) باریاب ہو مگر دوسروں کو وہاں لے جانے کی قوت و اجازت سے بہرہ ور نہ ہو۔" (حال سفر۔ ص ۹۵)

جبکہ حضرت سلطان باہوؒ نے یہ بات زیادہ واشگاف انداز میں یوں بیان کی ہے:

"مرشدِ کامل طالب اللہ کا ہاتھ پکڑ کر منزلِ مقصود (دربارِ اقدسؐ) تک

پہنچا سکتا ہے۔ جس شخص کو یہ قدرت نہ ہو اسے کامل کہنا غلط ہے بلکہ وہ راہزن ہے۔" (عین الفقر)

گویا تصوف انسانی معاشرے میں رہتے ہوئے شریعت کی پاسداری اور تحفظ کا نام ہے اور شیخِ کامل وہ چراغِ طریقت ہے جو شریعت کا سہانا اور حقیقی روپ دکھاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی تارکِ شریعت، تارکِ صوم وصلوٰۃ یا نبی کریمؐ کی روحانی سرپرستی سے بے بہرہ دین کا محافظ بن بیٹھے۔ شریعت اور طریقت کے تال میل سے تصوف وجود میں آتا ہے اور اس کا صحیح رستہ وہی ہے جس کی تعلیم قرآن وسنت نے دی ہو اور سند بھی انہی ماخذات سے حاصل کی جائے۔ دوسری صورت میں زندیق اور ملحد تو ہو سکتے ہیں مومن وصوفی نہیں۔

تاریخِ تصوف ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب ربِّ کائنات نے اپنے بندوں پر خاص کرم فرماتے ہوئے ان کے درجات میں اضافہ کیا اور ان پر اپنی رحمتوں کے در کھولے کیونکہ باری تعالیٰ نے رحمت کو خود پر لازم کر لیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

کتب ربکم علی نفسه الرحمة (الانعام۔۵۴)

"تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم کر لیا۔"

'دلیل العارفین' میں خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کا یہ قول ملتا ہے:

"عارفوں پر ایک حال ہوتا ہے۔ اس وقت وہ آگے بڑھتے ہیں اور ایک قدم حجابِ عظمت سے گزر کر حجابِ کبریائی تک جا پہنچتے ہیں اور دوسرے قدم میں واپس آجاتے ہیں۔" (ص ۱۴)

یاد رہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ملفوظات کو ان کے شاگرد اور مرید حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ نے محفوظ کر کے ''دلیل العارفین'' کا نام دیا تھا۔ سالکین کے واسطے یہ کتاب نعمت سے کم نہیں۔ ذوق وشوق اور مسافت کی لگن سالک کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور سرفرازی کا باعث بنتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

> ''مجھے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام سمجھایا کہ تمہارے اوپر دو جامع اسموں کا نور منعکس ہوا ہے یعنی اسمِ مصطفویﷺ اور اسمِ عیسویؑ۔ تو عنقریب کمال کے افق کا سردار بن جائے گا اور قربِ الٰہی کے تمام اقالیم پر چھا جائے گا'' (التفہیمات الالٰھیہ جلد۲ص۱۴۵)

ظاہری طور پر غیر تربیت یافتہ حضرات اس قسم کے دعووں پر استہزاء کر سکتے ہیں کیونکہ اُنہیں اس عالم اور کیفیت کا قطعی شعور نہیں ہوتا۔ منازلِ سلوک میں یہ بہت معمولی باتیں ہیں اور یقیناً تصوف کا مقصود بھی نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کرامتوں اور علم کے ذریعے اپنے بندوں کی دم سازی اور دلجوئی فرماتا ہے تاکہ مومنوں کی شکر گزاری کا بدلہ دے اور بے شک وہ وعدہ وفا کرنے والا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہاں اور وہاں کا نظام اور اوقات مختلف ہیں۔ جن کاموں کو لوگ مافوق الفطرت سمجھتے ہیں وہ اولیاء کی جبلّت بن جاتے ہیں۔ راقم اور اس جیسے تصوف کے راہی جب ان واقعات پر غور کرتے ہیں تو سوائے سبحان اللہ کے اُن کی زبان سے اور کچھ نہیں نکلتا۔ سچ ہے کہ طبائع کی ہم آہنگی ہی لوگوں کو ایک دوسرے سے ملاتی اور اُنہیں باہم متوجہ کرتی ہے۔ برزخ میں ملاقات کے دوران حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو جس مقام پر دیکھا وہ ہر کسی کے نصیب میں نہیں۔ میں نے بعد از سلام اُنہیں ''یا قائم الزّماں'' کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے سینے

سے لگاتے ہوئے فرمایا:

''پاکستان ایک بار پھر عارضی مشکل میں پھنس گیا ہے لیکن یہ امرِ ربانی ہے'
آپ فکر نہ کریں۔ انشاء اللہ خوشحالی اور ترویجِ اسلام کا دور قریب ہے۔''
مزید فرمایا..... ''حضرت باغ حسین کمالؒ کے بعد آپ نے سلسلہ عالیہ
اویسیہ کمالیہ کو اپنی ریاضت کے ذریعے خوب شباب دیا ہے۔''

میں نے عرض کیا..... ''یہ صرف میرے اللہ کا کرم، حضور نبی کریم ﷺ کی شفقت اور میرے حضرت جیؒ کی توجہ کا ثمر ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔'' مسافر 'فیوض الحرمین' میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی یہ عبارت دیکھ کر صاد کر چکا تھا۔

''مکّہ میں تھا کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو قائم الزماں دیکھا۔
اس سے میری مراد یہ ہے کہ جب اللہ نے اچھے نظام کو استوار کرنے کا
ارادہ کیا تو اس کے لیے مجھے قیام کا ذریعہ بنایا تاکہ اللہ تعالیٰ کی مراد
پوری ہو۔''

اس میں کیا شک ہے کہ شاہ صاحبؒ کے درجات بہت بلند ہیں اور برصغیر کے علماء و صوفیاء پر آپؒ کی تعلیمات کا بہت مثبت اثر ہوا۔ آپؒ ہی تھے جنھوں نے حضرت امامِ ربّانی مجدّد الف ثانیؒ کے بعد دین اسلام اور تصوّفِ حقیقی کی بے لوث خدمت کی اور ابن الوقتوں کی فتنہ انگیزیوں سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اور کیوں نہ ہو محدث دہلویؒ کا گھرانہ بنا ہی دین کی خدمت کے لیے تھا۔ میرے شیخِ مکرّم حضرت جی باغ حسین کمالؒ شاہ صاحب کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ فرماتے اور مجھے اکثر اُن کی تصانیف کے باریک نکات سے آگاہ کیا کرتے تھے۔

ولی تو حکمِ الٰہی کے بغیر بات ہی نہیں کرتا۔ چنانچہ 'قصیدۂ غوثیہ' میں حضرت

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

وما قلت حتی قیل لی قل ولا تخف

مانت ولی فی مقام الولایة

''میں نے کوئی بات نہیں کی مگر اُس وقت جب ارشاد ہوا کہ کہہ اور مت ڈر کیونکہ تو مقامِ ولایت میں میرا چُنا ہوا ولی ہے۔''

صوفی ظن و گمان میں مبتلا لوگوں کو یقین کی منزل تک پہنچاتا ہے اور اگر پھر بھی کوئی محروم رہ جائے تو اُس کی اپنی قسمت۔ عامی اہلِ صفا کی حقیقی حالت و کیفیت کا ادراک نہیں کرسکتا۔ حضرت شیخ صدرالدین قونویؒ حضرت مولانا رومؒ کی شان میں یوں رطب اللسان تھے:

لوکان للالوهية صورة لكان هذ

''اگر اللہ تعالیٰ کی کوئی صورت معیّن ہوتی تو وہ حضرت (مولانا رومؒ) کی صورت میں ظاہر ہوتا۔'' (ملفوظاتِ مہریہ، ص ۴۶)

سلوک وذوق سے نابلد اور عشق سے دور شخص یہ فقرہ سُن کر کانوں کو ہاتھ لگائے گا لیکن یہ مولائے رومؒ کا درجہ بتانے والا جملہ ہے۔ حضرت صدرالدین قونویؒ کوئی عام صوفی نہیں تھے اور حضرت مہر علی شاہ گولڑویؒ جیسے محتاط عالم اور ولی یونہی اُن کا قول نقل نہیں کرتے۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ مولانا رومؒ کا عشق اس مقام پر تھا جہاں رنگ و خوشبو ایک ہو جاتے ہیں اور اکائی پوری تابناکی کے ساتھ جگمگا اٹھتی ہے۔ ایک عامی تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا یہ قول:

قدمی هذه علی رقبه کل ولی الله

''تمام اولیاء کی گردنوں پر میرا قدم ہے۔''

پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائے کہ حضرت نے یہ کیا فرما دیا لیکن فقیر پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ اولیاء اللہ کی باتوں میں رمزیں ہوتی ہیں جنہیں کوئی ولی ہی سمجھ سکتا ہے۔ حضرت باغ حسین کمالؒ نے 'حالِ سفر' میں اس کی عقدہ کشائی یوں فرمائی ہے:

"آپ حضور ﷺ کے وسیع سیکرٹریٹ اور اولیائے زمانہ کے درمیان ایک ضروری کڑی ہیں۔"

ایک اور مقام پر غوثِ اعظمؒ نے یہاں تک فرما دیا ہے:

خضنا فی بحر لم یقف علی ساحله الانبیاء

"ہم نے اس دریا میں غوطہ لگایا جس کے کنارے پر انبیاءؑ کو کھڑا ہونا نصیب نہ ہوا۔"

مذکورہ نکتے کو حضرت مہر علی شاہؒ نے نہایت دل آویزی سے بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس قول میں دریا سے مراد حقیقتِ محمدیہ ﷺ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اُمّتِ محمدیہؐ کے اولیاء ہی اس حقیقت کے اداشناس ہو سکتے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پیرانِ پیر کے ارشاد پر اپنی گردن مبارک جھکا کر بادۂ تسلیم کا مزہ یونہی تو نہیں چکھا تھا۔

اولیاء کے ظاہری افعال و اعمال تو عام آدمی کے سامنے ہوتے ہیں جن کی خالی خولی گواہی دی جا سکتی ہے اور بس لیکن روحانی سفر اور اس میں پیش آنے والے حالات و واقعات کی تصدیق عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے اُسے اِس باب میں زحمتِ لب کشائی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ان معاملات کو خرد کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا کہ عقل بہرحال محدود دائرے میں سفر کرتی ہے جبکہ عشق لامتناہی مسافت کا نام ہے۔

ربِ کریم نے انسان کو سمجھ بوجھ کے لیے تین قوتیں وہم، عقل اور بصیرت عطا کی ہیں۔ عقل کے مقابل وہم کمتر درجے پر ہے اور نورِ بصیرت کے سامنے عقل کی کوئی اہمیت

نہیں۔ یہ قبلہ نما تو ہو سکتی ہے لیکن قبلہ نہیں۔ سو محض عقل و خرد پر بھروسہ کرنے والے کو

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور

چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

جیسی حقیقت سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ بدقسمتی سے ہم کرامت فروش دور میں جی رہے ہیں جہاں تارکینِ شریعت تصوف کے نام پر بلند بانگ دعووں سے دیواروں کی دیواریں سیاہ کیے بیٹھے ہیں۔ اگر اہل اللہ موجود نہ ہوں تو آس کے سُورج ڈوب جائیں اور ہر سُو تاریکیوں کے بھوت رقص کرنے لگیں۔ لیکن یہ صرف آج کا مسئلہ نہیں، ہر دور اس طرح کے مسائل سے آلودہ رہا ہے۔ یقیناً حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس طرح کی صورتِ حال ملاحظہ کی ہوگی کہ انھیں یہ کہنا پڑا:

"ایسے جاہل صوفی اور تصوف کے مدّعی (جنہیں قرآن و سنّت سے کوئی تعلق نہیں) دین کے چور اور ڈاکو ہیں۔"

(التفہیمات الالٰھیہ، جلد دوم)

شاہ ولی اللہ کا دور بہت حد تک ہمارے عہد سے مماثل تھا۔ وہ زمانہ مرہٹہ گردی، مسلمانوں کی باہمی منافرت، حکمرانوں کی عیش پرستی اور امتِ مسلمہ کے زوال اور اس پر اصرار کی بدترین مثال ہے۔ ہمارا عہد یہود، ہنود اور نصاریٰ کی سازشوں، امریکہ گردی، اہلِ اقتدار کی جاہ پرستی، ملّی غیرت سے خالی ضمیر اور اسلامی رُوح سے تہی دلوں کا عہد ہے۔ ایسے میں فقہا، صوفیاء اور علماء کا فرض ہے کہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں اور اللہ کی یاد اور نبی کریم ﷺ کی محبت سے دلوں کی دنیا آباد کرنے کی کوشش کریں تا کہ روزِ محشر شافعِ امم کے حضور شرمندگی نہ ہو۔ ایک عالمی طاقت (امریکہ) دندناتی پھر رہی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ دستِ اجل اس کے

تعاقب میں ہے اور انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب اسے خاک چاٹنا پڑے گی اور اُس کے لیے اپنا شیرازہ قائم رکھنا بھی محال ہو جائے گا۔ فقیر نے آج سے بہت پہلے ۱۸/ جولائی ۲۰۰۱ء میں امریکی شکست وریخت پر بات کرتے ہوئے ایک محفل کے سامعین کو گواہ بنا کر اعلانیہ کہا تھا ''......شیر کا شکار کرنے کے لیے اس کی کچھار میں نہیں گھسا جاتا بلکہ اسے نکال کر وہاں لایا جاتا ہے جہاں مچانیں لگی ہوں۔ گواہ رہیے گا کہ شیر کچھار سے نکل آیا ہے، ہانکا لگایا جا رہا ہے اور وہ اسی طرف آ رہا ہے جہاں مچانیں لگی ہیں۔ الحمدللہ، روحانیوں نے ''سپر پاور'' کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے انتظامات کو حتمی شکل دے دی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کو مبارک باد کہ امریکہ کے انہدام کا وقت آ گیا ہے۔''

شرط صرف اتنی سی ہے کہ اپنے اپنے دائروں میں رہتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری کی جائیں۔ آج فکر مند ہونے سے زیادہ اپنے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اہلِ نظر اس بات پر متفکر ہیں کہ قرآن وحدیث کی موجودگی میں جہالت اور دروغ فروغ پا رہا ہے۔ یہ مشائخ کا فرض ہے کہ وہ فکرِ سُودوزیاں سے بیگانہ ہو کر صاحبانِ اقتدار اور عوام کی رہنمائی کریں۔ فقیر کے نزدیک یہ تبھی ممکن ہے جب فقہا وصوفیاء میں ہم آہنگی ہو اور فیصلہ دیتے وقت احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ پھر انشاء اللہ کبھی کوئی اپنے بھائی کا گلہ نہیں کاٹے گا، اُسے کمتر نہیں سمجھے گا اور مسجد کے صدر دروازے پر لگی ہوئی تختی کسی کا راستہ نہیں روکے گی۔ تصوف کا عرفان اسی کو ہو سکتا ہے جو قرآن وسنّت سے آگاہ ہو اور انسانیت کی بھلائی کا جذبہ رکھتا ہو۔

ترویجِ دینِ حق اور فروغِ اسمِ ذات میں صوفیاء کا حصہ کسی بھی طبقے سے زیادہ ہے۔ تاریخِ تصوف اُن معظم ہستیوں کی قصیدہ خواں ہے جنھوں نے نہ صرف دینِ

فطرت کی سر بلندی کے لیے عمریں صرف کر دیں بلکہ طریقت کے مختلف سلاسل قائم کر کے انسانیت کی رہبری کا فریضہ بھی سر انجام دیا۔ ان میں سے ہر ایک کی عظمت اور شان امتیازی ہے۔ لہٰذا اس مقام پر معروف سلاسل اور ان کے بانیان کا مختصر تذکرہ کرنا ضروری ہے تاکہ قاری جان لے کہ تمام سلاسل ایک شاداب گلدستے میں سجے خوش رنگ پھولوں کی صورت کس طرح باہم پیوست ہیں۔

رسولِ کریم ﷺ شیخ السالکین ہیں اور خود ذاتِ باری تعالیٰ آپؐ کے شیخ۔ اس کے بعد تمام صحابہ حضورؐ کے سالک اور آپؐ اُن کے شیخ۔ یہ سلسلہ اسی طرح جدید دور تک آتا ہے۔ تمام سلاسلِ تصوف حضرت علیؓ کے ماتحت ہیں اور بلاشبہ آپؓ ہی رسول اکرم ﷺ کے بعد تمام صوفیاء کے شیخ ہیں۔

تاریخی اعتبار سے سب سے پہلا سلسلہ چشتیہ ہے جس کے بانی حضرت خواجہ ابو اسحٰق شامیؒ ہیں۔ آپؒ اپنے شیخ ممشاد علوی دِنّوریؒ کے حکم پر چشت آ کر قیام پذیر ہوئے۔ آپ رحمتہ اللہ کی وفات ۳۲۹ ہجری میں ہوئی۔ حضرت قطب الدین مودودؒ اور حضرت خواجہ عثمانی ہرویؒ (ہارونیؒ) اس سلسلے کے ممتاز اولیاء گزرے ہیں جبکہ برصغیر میں حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے ذریعے اس سلسلۂ عالیہ کو عروج حاصل ہوا۔ آپؒ حضرت عثمان ہرویؒ کے مرید تھے اور اُنہی کے فرمان پر ہندوستان تشریف لائے تھے۔

سرتاجِ اولیاء، پیرانِ پیر، مرکزِ رشد و ہدایت، حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ (پیدائش ۴۷۰ ہجری) سلسلہ قادریہ کے بنیاد گزار ہیں۔ آپؒ نے حضرت سعید ابوالخیرؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت پایا۔ مکتوبات' قصیدۂ غوثیہ اور فتوح الغیب آپؒ کی مشہور تصانیف ہیں۔ غوثِ اعظمؒ نہ صرف بہت سارے اساتذہ سے

علومِ قرآن وحدیث اور فقہ میں فیض یاب ہوئے بلکہ راہِ سلوک میں بھی اُن مراتب پر پہنچے جو آپؒ ہی کا افتخار ہیں۔ بغداد کا ہر دور میں علم و فضل کا گہوارہ رہنا آپؒ کی کرامات میں سے ہے۔

سلسلۂ سہروردیہ کے بانی صاحبِ 'آداب المریدین' حضرت ضیاء الدین سہروردیؒ ہیں لیکن اس کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے نمایاں ترین نام آپؒ کے بھتیجے اور مرید شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا ہے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی فیض یاب ہوئے۔ کتب میں آپؒ کا سنِ پیدائش ۵۳۶ ہجری ملتا ہے۔ آپؒ کی بلند پایہ تصنیف 'عوارف المعارف' آج بھی سالکین کے لیے خزینۂ رشد و ہدایت ہے۔ آپؒ کے مرید سعدی شیرازیؒ نے اپنی نظم و نثر میں اکثر اپنے شیخ کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ بھی آپؒ کے خلفاء میں سے تھے۔

ایک اور بلند پایہ سلسلہ نقشبندیہ ہے جو حضرت خواجہ محمد اتالیویؒ سے شروع ہوا لیکن اس کی زیادہ شہرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ کے دور میں ہوئی جس کے بعد یہ سلسلہ نقشبند کے نام سے معروف ہوا۔ آپؒ ظاہری طور پر حضرت خواجہ شمس الدین امیر کلالؒ کے خلیفہ تھے لیکن خاص بات یہ ہے کہ آپؒ حضرت خواجہ عبدالحق غجدوانیؒ سے اویسی طریقے پر مستفیض ہوئے۔ آپؒ کے خلفاء میں خواجہ محمد پارساؒ، خواجہ علاؤالدین عطارؒ اور مولانا یعقوب چرخیؒ بہت مشہور اولیاء ہیں جبکہ برصغیر میں حضرت مجددؒ الف ثانیؒ اس سلسلۂ عالیہ کی آبرو ہیں۔

راقم کو سلسلہ اویسیہ کمالیہ سے نسبت کی سعادت حاصل ہے۔ سلسلہ اویسیہ کی تاریخ نبی کریم ﷺ کے زمانۂ مبارک ہی سے آغاز ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں

برکات وانعامات کسی سالک کو براہِ راست حضورؐ کی بارگاہِ عالیہ سے پہنچتے ہیں تو کسی کو اہلِ برزخ کے ذریعے عنایت کیے جاتے ہیں۔ ترسیلِ فیض کا یہ انداز کہ جس میں ظاہری ملاقات کے بغیر بھی روح کو فیض یاب کیا جائے، اویسی کہلاتا ہے۔ جیسے حضرت اویس قرنیؓ حضور ﷺ کا زمانۂ مبارک میسّر آنے کے باوجود ظاہری طور پر شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکے لیکن اویسی طریق پر فیض یاب ہو کر فنا فی الرسولؐ ہو گئے۔ تمام بانیانِ سلاسل اور دوسرے اکابر اولیائے کرامؒ کی روحانی تربیت اویسی طریقے پر بھی ہوئی کہ انھیں اہلِ برزخ سے بھی رہنمائی حاصل رہی۔ یوں اگر دیکھا جائے تو درجۂ اولیت پر سلسلہ اویسیہ ہی فائز ہے۔ اس کا طلوع وغروب وقتاً فوقتاً جاری رہا یہاں تک کہ میرے حضرت جی حضرت باغ حسین کمالؒ منصبِ عبدتک پہنچے اور آپؒ کو وہ مقامات عطا ہوئے جو ہر کس و ناکس کا نصیب نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے آپؒ 'حالِ سفر' میں صفحہ ۱۲۳ پر رقم طراز ہیں:

> ''حضور ﷺ نے فرمایا......... جس غیر معمولی انداز میں تمہیں اویسی طریقہ پر کثیر تعداد میں نسبتوں اور اسنادِ خلافت وانعامات سے نوازا گیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ اب تم اپنی خلافت کا اعلان کر کے ظاہری طور پر بھی رشد و تلقین کا سلسلہ چلاؤ۔ تمام نسبتیں ضم کر کے تمہارے نام سے تصوف وسلوک کا ایک نیا سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔''

۸ر اپریل ۱۹۸۴ء سلسلہ اویسیہ کمالیہ کا یومِ تاسیس ہے۔ حضور ﷺ کی خصوصی روحانی توجہ کے باعث یہ سلسلہ بہت تیزی سے اطراف وجوانب میں پھیل کر دلوں کو اُجالنے اور اخلاق کو سنوارنے کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔

یہ تو معروف ومشہور سلاسل ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی بے شمار ذیلی سلاسل ہیں

جیسے رفاعیہ، مولویہ، صابریہ، نظامیہ، شطّاریہ وغیرہ اور ان میں بڑے بڑے اولیائے عظّام کی ذواتِ بابرکات گزری ہیں۔ قاری کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تمام دریا بالآخر ایک ہی سمندر میں جا کر گرتے ہیں۔ 'تصوف اور سرّیت' (ص۲۱۲،۲۱۱) میں 'پروفیسر لطیف اللہ' لکھتے ہیں:

> ''تمام سلاسل اس امر میں متحد ہیں کہ سالک کا اصل مطلوب حق سبحانہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے جو اخلاقِ فاضلہ کی تصحیح اور تہذیب سے حاصل ہوتی ہے۔ اخلاقِ فاضلہ کو اپنی ذات میں پیدا کرنے کے طریقوں میں قدرے فرق ہے۔ کوئی سلسلہ کسی طریقے سے مقصود کو پاتا ہے اور کوئی کسی طریقے سے مراد حاصل کرتا ہے۔ غرض مقصود و مطلب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

قرآنِ کریم نے خشیتِ الٰہی اور علم کو ایک دوسرے کے لیے لازم قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کا درجہ صوفیاء کے سوا تمام لوگوں سے بلند رکھا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

انما یخشی اللہ من عبادہ العلمؤا ان اللہ عزیز غفور (فاطر۔۲۸)

> ''اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو (اللہ کی ذات وصفات کا) علم رکھتے ہیں۔ تحقیق کہ اللہ زبردست بخشنے والا ہے۔''

صوفیانہ ادب نے انتہائی عرق ریزی سے تصوف کے معاملات اور انکشافات کو لوگوں تک پہنچاتے ہوئے اُن کے اندر شمعِ طریقت روشن کی۔ اس مقام پر شائقین کے لیے تصوف کی چند نادر کتابوں اور اُن کے مصنفین کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں تا کہ صاحبانِ ذوق استفادہ کر سکیں۔ حضرت ابونصر سراجؒ کی گراں قدر تصنیف اللمع فی التصوف، حضرت ابو طالب المکیؒ کا تحفۂ جانفزا قوت القلوب، شیخ ابو نعیم اصفہانیؒ کی

طبقات الاصفیاء، رسالۂ قشیریہ از شیخ عبدالکریم قشیریؒ، سیّد علی بن عثمان ہجویریؒ کی کشف المحجوب، حضرت امام غزالیؒ کی احیاء العلوم، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی غنیۃ الطالبین، فرید الدین عطارؒ کی تذکرہ الاولیاء، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی عوارف المعارف، مثنوی از مولانا رومؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی فوائد الفواد، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اخبار الاخیار، شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات، شاہ ولی اللہؒ کی انفاس العارفین، حضرت مہر علی شاہؒ کی شمس الہدایہ، حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کی دلائل السلوک اور حضرت باغ حسین کمالؒ کی حالِ سفر، یہ سب سالکین کو شوقِ سلوک دلانے میں معاونت کرتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے نہ صرف شوق فزوں تر ہوتا ہے بلکہ جذبوں کو مہمیز بھی ملتی ہے۔ حقیقت میں قرآنِ کریم اور کتبِ حدیث کے بعد یہی کتابیں (بشمول چند اور) اسلامی تصوف کا نچوڑ ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے لکھنے والے ولی بھی تھے اور عالم بھی اور اُنہوں نے اپنی ریاضت اور مجاہدات کا نچوڑ پوری دل نشینی کے ساتھ ان عبارتوں میں سمو دیا ہے۔ اب یہ طالب علم کی اپنی استعداد ہے کہ وہ ان سے کیا سیکھتا ہے۔ دراصل استفادہ کرنے کا جوہر بھی اللہ تعالیٰ کی عطاؤں میں سے ایک عطا ہے۔ سچی طلب ہی اس منزل پر رہنمائی کر سکتی ہے۔ مذکورہ کتابوں سے پہلے تصوف کا راہی اگر قرآن و حدیث اور فقہ سے معرفت حاصل کر لے تو کوئی وجہ نہیں کہ اخلاصِ نیّت اُسے عمل سے روکے اور منزلِ سلوک میں کہیں بھی پاؤں لغزش کا شکار ہوں۔ قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کر پوری توجہ سے تلاوت کرنا اپنی جگہ ثواب کا حامل ہے جبکہ آیات کی تفہیم و تفسیر بھی ذوق کو جلا بخشتی ہے۔ خاص طور پر وہ مدنی آیات جن میں **یا ایھا الذین امنوا** کہہ کر مومنین سے خطاب کیا گیا ہے نصیحت اور درس کا بہت دلکش انداز لیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے

اپنی تصنیف 'قرآن اور تصوف' میں بہت محنت سے ثابت کیا ہے کہ تصوف اُنہی لوگوں کا طریقۂ صادقہ ہے جو قرآن مجید کی سمجھ رکھتے ہیں اور اس کی رہبری میں سفرِ سلوک طے کرتے ہیں۔ یہاں مسافر اپنی معروضات مختصر کر کے ربِّ کریم کی عنایات کا شکر ادا کرتے ہوئے رودادِ سفر کا آغاز کرتا ہے۔

۱۹۷۵ء فقیر کی مسافتِ سلوک کے باقاعدہ آغاز کا زمانہ ہے کہ انہی دنوں یہ طالب حضرت جیؒ کی معیت میں حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کی بیعت سے مشرف ہوا۔ پہلی تلقین ریاضت ومجاہدہ کی تھی۔ شیخِ محترمؒ نے فرمایا..... "طلب کی منزلوں تک باریابی کے لیے قرآنِ کریم کی تلاوت اور اس کے احکامات پر عمل کیجیے۔" سو آغازِ مسافت میں ہی اوراد و وظائف کے ساتھ ساتھ فرقانِ حمید کی تلاوت مقدم کر لی۔ ۱۹۸۴ء میں حضرتِ موصوفؒ کی رحلت کے چند ماہ بعد فقیر نے اپنے اہلِ خاندان کے ہمراہ حضرت باغ حسین کمالؒ کے دستِ حق پر بیعت کی سعادت حاصل کی۔ شاعرانہ طبیعت نے اسے "بیعتِ کمال" کا نام دیا۔ حضرت جیؒ نے فرمایا..... "بشریت کا تقاضا ہے کہ ذکرِ الٰہی اور درود شریف کو ہر شے پر مقدم رکھو۔" تعمیلِ ارشاد کا وعدہ اور دُعا کی درخواست کی۔

ایک رات خواب میں نبیٔ کریم ؐ کی زیارت نصیب ہوئی، دیکھا کہ آپ ؐ فرما رہے ہیں ''اللہ کریم نے تمہاری ''بیعتِ کمال'' والی اختراع کو پسند فرمایا ہے۔'' عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ ؐ پر قربان، ان لمحات کی سرشاری کب میسر آئے گی جب اس عاجز کو آپ ؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف حاصل ہوگا۔'' اتنا کہنا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ ساری رات اور اگلے بہت سے شب و روز اسی بے چینی میں گزرے کہ وہ دربار جہاں ابوبکرؓ کی بزرگی، عمرؓ کے رُعب، عثمانؓ کی حیا اور علیؓ کے جلال کو تاب نہیں کہ اذن بغیر لب ہلا سکیں وہاں میں نے کیا درخواست کردی۔ دل نے کہا اپنے سفر کا تو خیال کیا ہوتا کہ ابھی شروعات ہیں۔ بے کلی اتنی بڑھی کہ کئی دن اس جسارت پر نادم رہا۔ بار بار معافی کا خواستگار ہوا مگر دوسری جانب سے حضوری کا کوئی اشارہ تک نہ تھا۔

ان دنوں بے کیفی حد سے سوا تھی۔ تمام سرگرمیاں لایعنی محسوس ہوتیں، گھر میں جی نہ لگتا اور اکثر کوئی کتاب بغل میں دابے پڑھنے کے بہانے گاؤں سے ملحقہ کھیتوں اور کسیوں میں بھٹکتا پھرتا، اکثر لبوں پر ایک ہی فریاد رہتی:

ع حضور ؐ بارِ دگر بلاوا، حضور ؐ پھر سے کرم کی بارش

اس ساعتِ سعید کی یاد آج بھی دل پر شبنم کی طرح برستی ہے جب روز و شب کی مناجاتیں درجۂ قبولیت سے ہمکنار ہوئیں اور رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ کی ایک مبارک شب حضرت جیؒ نے دربارِ اقدس ؐ میں پیش کیا۔ میں نے دوڑ کر پائے عرش مقام ﷺ چوم لیے اور اس قدر گریہ کیا کہ اہلِ محفل دلاسا دینے لگے۔ حضرت علیؓ نے سر پر ہاتھ پھیرا اور اٹھنے کی تلقین فرمائی۔ خاتم المرسلین ؐ، رحمت اللعالمین ؐ کا بحرِ کرم جوش میں تھا۔ آپ ؐ نے فرمایا.....

"بیٹے! شدتِ عشق عطا کے دروازے جلد کھول دیتی ہے۔ آؤ بیعت کرو۔"

اللہ اللہ، کہاں مجھ ایسا بے مایہ، کہاں محبوبِ الٰہیؒ۔ میں ایک بار پھر پائے مبارکؒ میں گر پڑا اور اتنے بوسے لیے کہ زبان میں فردوسی ذائقہ اتر آیا۔ اس اثناء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ نے رسالت مآب ﷺ کی اجازت سے میرا ہاتھ پکڑ کر آپؐ کے دستِ نورانی پر رکھا اور فرمایا "بیٹے پڑھو"

ان الذین یبا یعونک انما یبایعون اللہ (الفتح۔۱۰)

"بے شک جو لوگ آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔"

دستِ مبارک کے لمس سے کیا کیا کیفیات وارد ہوئیں، کیا کچھ عطا ہوا، اذن نہیں ورنہ بے خودی کہتی ہے کہ اہلِ دنیا کو بتاؤں کہ غلام کی حیثیت کیا ہے، بندگانِ عشق کا مرتبہ کیا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ سر آپ ﷺ کے قدموں میں پڑا رہے اور دم نکل جائے۔ عطائے ربانی اور فیضانِ نبوی ﷺ کی برکت سے میری زبان پر وہ آیتِ مبارکہ جاری ہوگئی جو بیعتِ رضوان کی بشارت دیتی ہے:

لقد رضی اللہ عن المومنین اذیبایعونک تحت الشجرہ (الفتح۔۱۸)

"بے شک اللہ ان مومنین سے راضی ہو گیا جنھوں نے درخت کے نیچے آپؐ کی بیعت کی۔"

اس حضوری کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی۔

سلسلۂ روز و شب اپنی مخصوص رفتار سے جاری تھا۔ کچھ عرصہ رویائے صادقہ کے ذریعے اشاراتی تربیت کا معاملہ رہا جس کے بعد کیفیات نے ایک وجدانی رنگ اختیار

کر لیا اور چند نادر واقعات کے ذریعے آئندہ مُسافت کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ ایک واقعہ کا ذکر بطور تحدیثِ نعمت بے جا نہ ہوگا۔ قیامِ راولپنڈی کے پہلے دور میں ایک روز نمازِ عشاء کے بعد اوراد و وظائف میں مشغول تھا کہ نبی کریمؐ اکابرین کے ہمراہ تشریف فرما ہوئے۔ میں نے آپؐ کے نعلینِ پاک کے بعد سب حاضرین کی قدم بوسی کی۔ رحمت اللعالمینؐ میری طرف بڑھے اور مجھے کھڑا رہنے کا اشارہ فرمایا۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کی مبارک انگشتِ شہادت سے میرے سینے پر لکیر جیسا لمس بنا دیا۔ مجھے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں اور یوں لگا جیسے میرا وقت آخر آ گیا ہے۔ پھر آپؐ نے اسی طرح ایک بار پھر انگشتِ مبارک سے اس عمل کو دہرایا۔ فقیر نے محسوس کیا کہ وہ اس جہان میں نووارد ہے اور یہ دنیا اس کے لیے نئی ہے۔ روح ایسے مصفا ہو گئی جیسے یومِ الست میں تھی اور دل سے غرض کی آلودگی سراسر دھو دی گئی۔ الحمدللہ۔ آپؐ نے فرمایا..... "بیٹے پڑھو، رب الشرح لی صدری ویسرلی امری"۔ میرے تعمیل کرنے پہ آپؐ نے سینے سے لگاتے ہوئے ارشاد فرمایا..... "بیٹے، ہم نے آپ کو پاک کر دیا۔ لوگوں کی پاکیزگیٔ قلب پہ توجہ دیں اور اللہ کی شکر گزاری کو حرزِ جاں بنائے رکھیں"۔

میں نے مذکورہ واقعہ کا ذکر اپنے والدِ گرامی اور شیخِ محترم سے کیا تو آپؒ نے مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا..... "بیٹے کتبِ تصوف میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے کہ سالکین کو ان کے شیوخ نے مختلف طریقوں سے تطہیر کے عمل سے گزارا اور اویسیوں کو تو یوں بھی طویل وسیلوں کی ضرورت نہیں پڑتی، نبی کریمؐ خود ان کی رہنمائی اور نگرانی فرماتے ہیں لیکن آپ پر ہونے والا کرم چیزے دیگر ہے۔ آپ ﷺ کے دستِ مقدس سے شرحِ صدر کا ایسا واقعہ اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزرا"۔

حضرت جیؒ کے وصال (۳۱/دسمبر ۲۰۰۰ء) اور اپنی دستار بندی (۲۵/مارچ ۲۰۰۱ء)
کے بعد مسلسل امتحاناتِ ظاہری و باطنی کا سامنا رہا اور چند وابستگانِ سلسلہ کی ترجیحات
میں تغیّر کے سبب سلسلۂ عالیہ کی حقیقی روح متاثر ہوتی نظر آئی تو کچھ مشائخ،
سلسلۂ عالیہ کو کم از کم سو سال کے لیے موقوف کرنے کی تجاویز پر غور کرنے لگے۔ ایسے
میں نبی کریمؐ نے فقیر کی درخواست پر اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا اور
بالآخر میری معروضات پر اظہارِ اطمینان کے بعد استقامت اور ثابت قدمی کی دعاؤں
کے ساتھ عارضی ہجرت کا حکم صادر فرماتے ہوئے اکابرین کو توجہ میں اضافے اور اس
بحث کے خاتمے کی خصوصی تلقین فرمائی۔ ایک روز دورانِ مراقبہ باریابی ہوئی تو
حضورﷺ نے فرمایا..... ''سلسلہ اویسیہ مختلف زمانوں میں تعطّل کا شکار رہا ہے لیکن
انشاءاللہ اب سلسلہ اویسیہ کمالیہ تا قیامت جاری رہے گا۔''

تمام حاضرین نے ''آمین'' کہا اور فقیر کو مُبارک باد دی۔ اس اثناء میں ایک
نورانی بزرگ ہاتھوں میں نہایت خوش رنگ سنہرے مشروب کے بلوریں گلاسوں پر
مشتمل طشت تھامے وارِدِ خدمت ہوئے۔ نبی کریمﷺ نے فقیر پر متبسم نگاہ ڈالتے
ہوئے دریافت فرمایا..... ''کیا انھیں پہچانتے ہیں؟'' میں نے دست بستہ عرض
کی..... ''یارسول اللہﷺ! اگرچہ اس سے قبل ان کی زیارت سے مشرف نہیں ہوا لیکن
دل گواہی دے رہا ہے کہ صدیوں کی شناسائی ہے، جب یہ تشریف لائے تو ان کے
لبوں پر تبسّم تھا۔ نور کی ایک لکیر نکل کر میرے سینے پر پڑی جو تطہیرِ قلب کے سوا کچھ
نہیں۔ میں نے آپﷺ اور اصحابِ کبارؓ کے علاوہ اتنے خوبصورت دندانِ مبارک کبھی
نہیں دیکھے۔'' میرا اتنا کہنا تھا کہ سرورِ انبیاءؐ نے میرے سر پر محبت سے اپنا دستِ شفقت
رکھا اور فرمایا..... ''ٹھیک ہے ہم یہ شربت آپ کو انہی کے ہاتھوں پلائیں گے۔'' پھر

حاضرین سے استفسار کیا "اب آپ کا کیا خیال ہے۔" خلفائے راشدینؓ نے بیک آواز فرمایا...... "بے شک امتحان کامیاب رہا۔ ہمارے خدشات دور ہو گئے۔" اس گفتگو کے دوران میں حیران سا مؤدب کھڑا رہا۔

سرکار ﷺ نے فرمایا..... "بیٹے میرا خیال تھا کہ سلسلہ اویسیہ کو تسلسل عطا کر کے عالمِ اسلام کے روحانی و سیاسی معاملات آپ کے سپرد کر دیئے جائیں لیکن ضروری تھا کہ پہلے امتحان ہو جائے۔ الحمدللہ آپ کامران ٹھہرے۔" ہر جانب سے مبارکباد کی صدائیں بلند ہوئیں اور میں نگوں سار کھڑا رہا۔ پھر جوشِ عقیدت میں نبی کریمؐ سے لے کر تمام حاضرین کے مبارک ہاتھ چومے۔ جب صاحبِ طشت بزرگ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تو انھوں نے حضورؐ کا اشارہ پا کر سینے سے لگا لیا۔ میری یہ حالت کہ اشک تھمتے نہ تھے۔ عنایات اور وہ بھی دربارِ اقدسؐ سے، جذبات کا ایک جوار بھاٹا تھا لیکن میں خاموشی سے دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کرتا رہا۔

کچھ دیر مزید گزری تھی کہ آپ ﷺ کے لب ہائے مبارک ہلے اور فرمایا...... "تابش بیٹے! یہ اویس قرنیؒ ہیں۔ آپ کا امتحان یہی تھا کہ اپنی نسبت کی جانب آپ کی کشش کتنی ہے۔" میں ایک بار پھر عاشقِ صادقؒ کے سامنے جھکا تو انھوں نے میری دونوں جانب بوسے لیے اور وہ کچھ انعام کیا جو بیان سے باہر ہے۔ عطا کرتے جاتے اور جناب رسالتمآبؐ کی جانب دیکھتے جاتے۔ حضور ﷺ ان کے ہر کلمے پر "آمین" کہتے جس کے بعد صحابہ کرامؓ بھی پیروی فرماتے۔

آخر میں نبی کریمؐ نے فرمایا...... "بیٹے اس سے قبل یہ معاملات کمال صاحب (حضرت جیؒ) سرانجام دے رہے تھے۔ اب ان امور کو وہ برزخ سے دیکھیں گے۔ عالمِ ظاہر میں ہونے کے باعث یہ ذمہ داری آپ کے سپرد کی جاتی ہے۔ آپ

حضرت علیؓ اور میرے ماتحت کام کریں گے اور اپنی کارکردگی کی اطلاع دیں گے۔ تمام اصحابِ کرامؓ اور اولیائے عظامؒ کی رہنمائی اور معاونت آپ کے شاملِ حال رہے گی۔ باقی تفصیلات (شیخ) عبدالقادر جیلانیؒ اور (حضرت) باغ حسین کمالؒ بتا دیں گے۔ آپ کا مشن فروغِ اسلام اور اس کے خلاف سازشوں کی بیخ کنی ہے۔ سب سے پہلے پاکستان کے استحکام کو یقینی بنائیں۔"

میں جان گیا کہ ایک انتہائی دشوار کام میرے ذمّے ہوا ہے۔ اسی تذبذب کی کیفیت میں گزارش کی..... "یا رسول اللہ ﷺ آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر تمام بزرگ اتنی ارفع شان والے ہیں کہ انھیں کوئی ذمہ داری سونپتے ہوئے میرا قد میرے آڑے آجائے گا۔" نبی کریمؐ نے تبسّم فرمایا اور گویا ہوئے..... "بیٹے تردّد کی ضرورت نہیں، اطمینان سے اپنا کام کرتے رہیں۔ آپ کو چند حضرات کی ایک فہرست دے دی جائے گی۔ فوری طور پر ان کی ڈیوٹی لگا کر مجھے رپورٹ دیں۔" بات دراصل یہ ہے کہ ارواحِ مقدسہ کا فیض اُن کی ظاہری پردہ پوشی کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور اہلِ زمین کے معاملات ان کے روحانی تصرف کی بدولت بہتری کی جانب گامزن ہوتے ہیں مگر یہ بھی قانونِ الٰہی ہے کہ انتظامی امور کی ظاہری باگ ڈور بہر حال ایک زندہ شخص ہی کے حوالے ہوتی ہے۔ جو ذمہ داری میرے سپرد فرمائی گئی وہ اتنی کٹھن تھی کہ بظاہر کامیابی کے امکانات معدوم تھے مگر حضرت جیؒ اور جنابِ غوث الاعظمؒ نے دلاسا دیا تو ہمت بندھی۔

ایک روز حاضری کی نوید ہوئی تو میں دست بستہ بارگاہِ عالی مقام ﷺ میں پہنچا۔ حضرت علیؓ نے حضورؐ کے اشارۂ مبارک سے ایک زرفشانی ورق میری جانب بڑھایا۔ میں نے ورق کو ادب سے تھام کر آنکھوں سے لگانے کے بعد پڑھا تو حیرت کی انتہا نہ

رہی کہ بعینہٖ انہی دس ناموں کی فہرست تھی جو حسنِ اتفاق سے میرے ذہن میں تھے۔

حضور ﷺ نے فرمایا..... ''ایران، ترکی، مصر اور چین پر خاص توجہ دیں۔ مقررہ مدّت میں سارا کام مکمل ہونا چاہیے۔ حضرت علیؓ آپ کی سرپرستی فرمائیں گے۔ فوری رہنمائی کے لیے اپنے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ سے مشورہ کر لیا کریں۔'' میں اجازت کے لیے جھکا تو سرکارؐ نے ماتھا چوما اور فرمایا..... ''زمین پر کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو برزخ اور افلاک کے تمام منطقے دکھا دیئے جائیں تا کہ بعد کی تمام منازل آسان ہو جائیں۔ آپ کا سفر کسی بھی وقت شروع ہو سکتا ہے۔''

دربارِ اقدسؐ سے واپس آتے ہی دنیا کو دس حصوں میں تقسیم کیا اور تمام بزرگوں سے روحانی رابطہ کر کے ہر علاقہ ایک محترم کی نگرانی میں دے دیا۔ ان جلیل القدر ہستیوں نے محبت اور خلوص کے ساتھ تعاون کا یقین دلایا اور شفقتوں سے نوازا۔ فقیر کو تفصیلی بیان کا اذن نہیں، کچھ وضاحت بھی اس لیے کی کہ بنیاد قائم ہو سکے۔ یوں بھی راقم حالِ سفر اختصار کے ساتھ کہے گا کہ شوق و ذوق کے حامل اپنی اپنی استعداد کے مطابق نکات کو کھولیں اور حسبِ توفیق فیض پائیں۔ فقیر کے مشاہدات کی ابتدا ارضی سیر سے ہوئی۔ ہفت بحر کا ایک ایک عالم، قطرہ قطرہ کھولا گیا تا کہ زائر عجائبات ملاحظہ کرتے ہوئے تسبیح کرتا چلے۔

تلخ وشیریں ذائقوں میں قدرت نے کیا کیا نشانیاں رکھیں کہ زمین بٹ گئی اور بعد میں یہی بحور براعظموں کی تقسیم کا باعث بنے۔ ہر دریا میں اس زمین کا ذائقہ تو ہے ہی جس پر وہ بہتا ہے لیکن کہیں لطفِ پروردگار ہے اور کہیں ہیبتِ کبریا۔ کچھ ایسے ہیں جن کے پانی کی بُو سے جان دار بے جان ہو جائے اور کچھ ایسے کہ نافع اور پرورش کرنے والے ہیں۔ پھر ان کے بہاؤ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں ترتیب کے ساتھ رکھے گئے جن کی شاخیں بھی تہذیب اور تنظیم کی مدح کرتی ہیں۔ مسافر نے شور وشیریں بحور کے عجائبات دیکھے، مخلوقات کا مشاہدہ کیا اور احمر واخضر کی نشانیاں ملاحظہ کیں۔ روشنی اور تاریکی کا حال کھلا تو 'مرج البحرین' اور 'منبع البحرین' کی حقیقت واضح ہوئی۔ بے شک چشمہ حیات ذاتِ باری تعالیٰ کی عجیب اور عظیم نشانی ہے۔ دو پانیوں کے درمیان مگر ابدی زندگی دینے والا۔ اس دوران کھلا کہ ملاپ زندگی کی نشوونما

کرتا ہے۔ بحور کے وصال کا مقامِ خاص، حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ کی جائے ملاقات دیکھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ جناب خضرؑ کو پہچان کر عرض کی ''عشق حیات ابدی ہے اور یہ عاجز اس پانی کو چلتے دیکھ کر عاشقِ حقیقی کا توکل یاد کرتا ہے۔ توکل ہی ابدی زندگی ہے اور وصال کو فنا نہیں۔''

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا
توکلت علی اللہ تعالیٰ

فرمایا..... ''یہ وصل کی خواہش ہی تو ہے جو مومن کو توکل عطا کرتی ہے۔ وہ اُسی کی جانب دیکھتا ہے جو آخر کار اسے اپنا جلوہ دِکھائے گا۔'' پھر آپؑ نے فقیر کو دعوت دی ''اس میں سے اگر کچھ پینا ہے تو اجازت ہے۔'' عرض کی..... ''اے رہنمائی کرنے والے! ہم اُمتِ عظمیٰ کے حقیر سہی، فخرِ انبیاءؐ کی نگاہِ پاک سے بڑھ کر کون سا جامِ حیات ہے جو ابدی کیف دے۔ خدا شاہد ہے کہ اُن کی محفل میں گزرا ہوا ایک ایک پل ہزار صدیوں سے بڑھ کر ہے۔'' داد دینے کے انداز میں فرمایا...... ''آپ معیارِ عشق پر پورے اترے۔ بے شک محمدِ عربیؐ کی اطاعت میں زندگی بسر کرنے والے حیاتِ جاودانی پائیں گے۔ میری دعا ہے کہ ربّ کریم رسولِ پاک ﷺ کے عقیدت مندوں کی یہ شان سلامت رکھے۔''

میں نے دریائے اسود کی بابت حضرتؑ سے دریافت کیا اور اس کے اخفاء کو مصلحتِ ربّانی جان کر سر جھکا دیا۔ بحر اسود گویا ارضی سطح پر شانِ احدیت کا جلال ہے۔ ابتدا اور انتہاء سے وراء، ادراک سے بالا، صفات کے لیے محال اور ذات کا اظہار۔ یہاں کی مخلوق عجب العجائب ہے جبکہ احمر و اخضر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک معاون اور مونس دوسرا مخلوق سے خالی اور ہلاک کرنے والا حتیٰ کہ اردگرد والوں کو بھی

پناہ نہ دینے والا۔ احمر ہمدم، غم خوار اور دوست ہے، سچے موتیوں سے بھرا ہوا، مومنین کو جگہ دینے، ان پر راستے کھولنے اور روح کو سہلانے والا۔ مجھے اس کے پانی میں مادرانہ شفقت اور پدرانہ انس ملا۔ وہاں فہم کو زیبائی اور نکتہ رسی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اخضر دلدل کی طرح اپنی طرف کھینچتا اور ہلاکت خیز تباہی سے دوچار کرتا ہے۔

الامان ۔ الحفیظ ۔ ان اللہ علی کلی شئ قدیر

مسافر جب اپنی فرشی اور عرشی مسافت مکمل کر کے لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ دریاؤں اور آسمانوں کی کیفیت و حالت میں بہت مماثلت ہے۔ یوں ارض و سما کا توازن بھی سمجھ میں آیا اور صانعِ کامل کی حمد کا نیا موقع نصیب ہوا۔ شعر کا ذوق ہے اس لیے راقم تلازمے کے پردے میں بعض رشتوں کو جان لیتا ہے۔ گویا فنِ شاعری اگر حقیقی طلب کا حامل ہو تو معنی کھل جاتے ہیں۔

ع شاعری جزویست از پیغمبری

دریاؤں کا وظیفہ اس لیے کیا گیا کہ انواع واقسام میں زمان و مکاں کے خالق کی ثناء منظور تھی ورنہ عجائبات اور مظاہر کا شمار انسانی ذہن سے بہت بالا اور بعید ہے۔ زائر ان سے گزر کر زمینوں کی سیر کو نکلا جس کا اذن دربارِ اقدس ﷺ سے ملا تھا۔

طبقاتِ سبعہ میں تہ در تہ بچھی زمین حیرت و استعجاب اور عظمت و کبریائی کا مقام ہے۔ فقیر نے اِن زمینوں کو ایک دوسرے سے یکسر مختلف پایا اور دیکھا کہ رنگ، ہیئت، کیفیات، اثر، مخلوق اور نوع کے اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ پہلے طبقے میں ذی نفس قیام پذیر ہیں۔ یہاں خاکستری رنگ چھایا ہوا ہے حالانکہ ابتدا میں یہ بیضہ سے زیادہ اُجلا اور رنا۔فی سے بڑھ کر مہکار کا حامل تھا۔ اس کا بنیادی رنگ بدل جانے کے باوجود اللہ نے اِسے سب سے بلند تر مرتبہ عطا کیا ہے کہ یہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر قیام پذیر ہوئے اور کلمۃ اللہ کی بنیاد پڑی۔ ایک حصہ خشکی اور باقی سب پانی ہے۔ یہاں ظلمات میں یاجوج ماجوج ہیں جو نفسی حصار میں ہیں۔ چاٹتے جاتے ہیں مگر دیوار ہے کہ قائم ہے۔ مسافر کو بتایا گیا کہ نزولِ مہدیؑ تک یہ عمل جاری رہے گا پھر یہ قتل ہوں گے۔ یہ بشارت بھی دی گئی کہ لشکرِ مہدیؑ کا ہراول دستہ ذاکرین پر مشتمل ہوگا اور

نمایاں خدمات سرانجام دے گا۔ حقیقتِ سلوک سے ناآشنا قاری اس بات پر حیرت کا اظہار کرسکتا ہے لیکن ذاکرین کی اہمیت کے حوالے سے 'مسلم شریف' کی یہ حدیثِ مبارکہ پیشِ نظر رہنی چاہیے:

عن انس رضی الله عنه ان رسول اللهﷺ قال: لاتقوم الساعة علی احد یقول الله الله

''حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا ''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک دنیا میں ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا موجود ہے۔''

اجتماعی ذکر کے حوالے سے بخاری شریف کی یہ حدیث خاص طور پر توجہ کی حامل ہے۔

لایقعد قوم یذکرون الله الا حفتهم الملائکه و غشتیهم الرحمته و نزلت علیهم السکینته و ذکر هم الله فیمن عنده هم القوم لایشقی جلسیهم

''جب کچھ لوگ مل کر ذکر کے لیے بیٹھتے ہیں تو ملائکہ انھیں ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے۔ اور سکینہ نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ملائکہ میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ وہ ایسی جماعت ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہ سکتا۔''

مندرجہ بالا احادیث سے ذکرِ الٰہی، اولیائے کرام کی صحبت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی برکات واضح طور پر اجاگر ہوتی ہیں، یہاں تک کہ:

ع صحبت صالح ترا صالح کند

کے تحت صرف صحبت ہی اتنی نافع ہوتی ہے کہ خوش بختی انسان کا مقدر بن جاتی ہے اور وہ حبِ الٰہی سے بہرہ مند ٹھہرتا ہے۔ اصطلاحِ تصوف کی رُو سے اسمِ ذات کی مداومت ذکر کہلاتی ہے۔ دلوں کی زندگی اللہ کا ذکر ہے اور اس کی لَو کائنات کے جس ذرے تک پہنچتی ہے اسے زندہ کر دیتی ہے۔ جب اسمِ ذات کی تجلیات ذاکر پر وارد ہوتی ہیں تو رفتہ رفتہ اس کی صفات و برکات سالک کے دل میں سرایت کرتی چلی جاتی ہیں۔ گویا ذکر سے نہ صرف روح کو تقویت ملتی ہے بلکہ اس کے خواص و اثرات بھی قلبِ انسانی پر مرتب ہوتے ہیں اور یوں سالک کی شخصیت خاص انداز میں افزائش پاتی ہے۔ صوفیاء کے ہاں ذکر کئی طریقوں سے رائج ہے جن میں سے ذکرِ جہر، ذکرِ پاس انفاس، ذکرِ نقش، ذکرِ خفی اور ذکرِ یاداشت زیادہ معروف ہیں لیکن اس حوالے سے نبی کریم ﷺ کی رہنمائی حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

خیر الذکر الخفی (مسندِ احمد)

''سب سے بہتر ذکر، ذکرِ خفی ہے۔''

سو قارئینِ محترم اس سے پہلے کہ یہ سازِ ہستی بے صدا ہو جائے، ذکرِ خفی قلبی کو معمولِ حیات بنالیں تاکہ اللہ کی محبت کو استحکام اور دوام حاصل ہو۔

شمال یعنی اُتّر کی زمین ابھی تک اسی طرح اُجلی ہے جیسا کہ ابتدا میں تھی۔ یہیں دراصل حضرت خضرؑ کی شاہی ہے البتہ کہیں بھی جا سکتے ہیں کہ فی زمانہ یہ اقلیم انہی کے حکم میں دی گئی ہے۔ طبقۂ اوّل کا یہ حصہ برگزیدہ مخلوق کا مسکن ہے۔ یہاں فقیر کو **اللہ نور السمٰوت والارض** کا مفہوم سمجھ آیا۔ مسافر نے ابتدائی ارضی رہائش کو سلام کیا تو جواباً امتِ مسلمہ پر سلامتی بھیجی گئی اور ذاتی حوالے سے بہت سی خبریں دی گئیں۔

زمین کا طبقہ دوم اہلِ ایمان جنوں کا مسکن ہے۔ یہاں عشق ہے اور دوام کا

احساس ہوتا ہے جس کے باعث طبع لہلہا اٹھتی ہے۔ مگر یہ بھی ربِّ کریم کی قدرت ہے کہ یہ جن، انسان کے بنیادی جوہر یعنی حُب اللہ، عشقِ رسولؐ اور جذبۂ ایمانی کی تاب نہیں لا سکتے لہٰذا کلمہ گو ہونے کے باوجود پیچ وتاب کھاتے اور عداوت پر مائل رہتے ہیں۔ البتہ اتنا ہے کہ راقم نے وہاں کسی جن کے ہاتھوں انسان کی ہلاکت اور ایذا ملاحظہ نہیں کی جیسا کہ بعض کُتب میں مرقوم ہے۔ ممکن ہے ان مصنفین کے تجربات میں ایسے واقعات آئے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ راقم نے مشاہدہ کیا کہ اس طبقۂ زمین میں روز و شب کے اوقات طبقۂ اول سے مختلف ہیں۔ لہٰذا یہاں ہنگامِ عبادت و ذکر میں تبدیلی لازم ہو جاتی ہے۔

پاندھی تیسرے طبقے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے حالات دوسرے طبقے سے یکسر جُدا ہیں۔ ایمان کی رمق نہیں، ہر جانب کفر و الحاد کی نحوست ہے۔ یہاں کے جن طبقۂ اوّل میں جا کر گمراہی اور شرک پھیلاتے ہیں اور انسان کی صُورت بدل کر یوں گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی شناخت صرف عارف ہی کر سکتا ہے سو ایمانِ کامل والی آبادی کا رُخ نہیں کرتے۔ انھوں نے اس عاجز کو دیکھا تو دُور بھاگے۔ بسم اللہ شریف اور درودِ پاک کا حصار مسافر کو حفاظت میں لیے مُشاہدہ کراتا رہا اور دیکھا کہ نہایت کراہت بھری صورتوں کے حامل ہیں اور تجلّیاتِ اسمائے حُسنہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ نُور سے بھاگتے ہیں اور یہ جاننے کے باوجود کہ باطل پر ہیں، شرک سے کنارہ نہیں کرتے۔ فقیر نے اپنے شیخِ محترم کے تتبع میں دعوتِ حق کا آغاز کیا اور الحمدللہ جنات کے بے شمار قبائل دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت خضرؑ پہلے ہی وظیفۂ 'والناس' کی اجازت مرحمت فرما چکے تھے سو پڑھتا جاتا اور بڑھتا جاتا۔ یہ جائے عبرت ہے اور پناہ مانگنی چاہیے تا کہ باری تعالیٰ نبی کریمؐ کے صدقے کشادگیٔ قلب

عطا فرمائے۔ یہاں ختم اللہ علی قلوبھم کی تفہیم بھی ہوئی اور بتایا گیا کہ مُہر کیے گئے دلوں میں انسان ہی نہیں جنات کے قلوب بھی شامل ہیں۔ اس طبقہ کے مشرک جن کسی صورت مومنین کی شکل میں نہیں آ سکتے تاہم اس کام کے لیے اُنھیں ضعفِ ایمان میں مبتلا کئی انسان میسّر آ جاتے ہیں۔ فقیر اس سفر پر روانگی سے قبل اپنے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ سورۃ الناس کی تلاوت ایمان کی پختگی کا باعث بنتی ہے اور اگر اس سے پہلے سورۃ اخلاص بھی پڑھ لی جائے تو مسافت آسان رہتی ہے۔

زمین کا چوتھا، پانچواں اور چھٹا طبقہ سفلی مخلوقات کا ٹھکانا ہے۔ ان زمینوں پر لال، نیلا اور سیاہ رنگ چھایا ہوا ہے جو دغا، فریب، قتل و غارت اور گمراہی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں کراہت اور سفلے پن کا احساس نمایاں ہے۔ ان طبقات کے جنات و شیاطین بھٹکے ہوئے اور صراطِ مستقیم سے یکسر دُور ہیں۔ ان کا کام ہی ہلاکت، شرک اور کفر کی تعلیم دینا ہے۔ چھٹے طبقے کے انتہائی سرکش و نافرمان باسی مٹی، آگ، ہوا وغیرہ کی اقسام سے ہیں۔ یہاں عناصر کی کارفرمائی پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کچھ فریب و مکر میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کچھ خدشات اور وسوسے پیدا کرتے اور شبہے میں ڈالتے ہیں۔ بعض حدودِ عنصری سے باہر نہیں نکل سکتے سو خود کو کوسنے اور اپنا سر پھوڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ چند ایک نکلتے ہیں اور انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ان گروہوں پر کوئی نہ کوئی ابلیس حاکم ہے جو انھیں مکروہات اور لغویات کی تربیت دیتا ہے۔ سب سے اوپر وہ ہے جس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ شیاطین کا یہی سرغنہ انھیں احکامات دے کر مختلف کاموں پر مقرر کرتا ہے جن کی انجام دہی میں یہ کمزور اہلِ ایمان پر یلغار کر کے پے در پے بدعات و منہیات میں مبتلا کر ڈالتے ہیں۔

راقم نے انھیں دیکھ کر جان لیا کہ ابلیس کی ذرّیت ہے لہٰذا ہر مقام پر لاحول ولا قوة الا باالله العلی العظیم کو وردِ زبان رکھا اور یوں محفوظ رہا کہ فقیر کو دیکھ کر گویا دانت کچکچاتے تھے مگر ہیبتِ حق کے باعث دم نہ مار سکتے تھے۔ خالقِ کائنات نے انسان کی عبرت کے لیے کیا کچھ سامان کر رکھا ہے اور مومن کو ایسی قوتِ ایمانی سے نوازا ہے کہ شیاطین و منکرین اس کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔

الغرض ان طبقات کے شیاطین کی اقسام بے شمار ہیں۔ لالچ، جُرم، گناہِ کبیرہ کی ترغیب دینے اور شہوانی جذبات کو بھڑکانے والے۔ یہ عبادت سے روکتے ہیں اور ایسا ڈھنگ اختیار کرتے ہیں جو طمع دار کو گھیر کر لعنت آمیز رنگینی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی معصیت کا ارتکاب ان کا پسندیدہ عمل ہے اور وہ اس کی ترویج میں یوں مگن ہیں کہ صرف اللہ کا کرم اور حضورﷺ کی شفقت ہی ان کے شر سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ انھیں دیکھنے والا کراہت کے سبب سُدھ بُدھ کھو بیٹھے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو ہمہ وقت انسان کے تعاقب میں رہتے ہیں تا کہ اُسے سرکشی پر آمادہ کر سکیں۔ کچھ چکمہ دے کر بھٹکاتے اور آناً فاناً انسان کی منزل کھوٹی کر دیتے ہیں۔ ایک غافل انسان ان کے حسبِ منشاء ہر خطا کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے مگر ضعفِ ایمان اس کے سوچنے کی صلاحیت ہی سلب کر لیتا ہے اور وہ ہوش آنے پر حیرت و ندامت کا اظہار کرتا ہے۔ مسافر نے ایسے شیاطین بھی دیکھے جن کی موجودگی روح ہی محسوس کر سکتی ہے اور تنگی میں معلوم ہوتا ہے کہ جکڑن سخت ہے۔ الامان، الحفیظ۔ یہ بہت قوی ہیں، مرکز پر حملہ کرتے ہیں۔ ان کے گرو نے انھیں بتا رکھا ہے کہ اصل مقام روح ہے جہاں پر لگی ہوئی ضرب انسان سے ہوش و حواس چھین لیتی ہے۔ فقیر کو یاد آیا کہ انسانوں میں ان کے نمائندے بہت شیریں گفتار اور بظاہر اللہ کی قسمیں کھانے

والے ہوتے ہیں مگر درحقیقت تنازعات پیدا کرنے والے اور اللہ سے دور لے جانے والے۔ سورۃ البقرہ (۲۰۴۔۲۰۵) میں ارشاد ہے:

ومن الناس من يعجبك قوله في الحيوة الدنيا و يشهد الله على ما قلبه وهو الدالخصام و اذا تولى سعى في الارض ليفسدفيهاو يهلك الحرث والنسل

''انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، دنیاوی زندگی کے بارے میں جن کی باتیں تمہیں تعجب میں ڈال دیتی ہیں اور اچھی لگتی ہیں۔ جو اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ سخت ترین دشمن ہیں اور جب وہ تمہارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کرتے ہیں اور کھیتیوں اور نسلوں کو برباد کرتے ہیں۔''

راقم نے دیکھا کہ نافرمانی ان کے خمیر کا جزوِ اعظم ہے۔ جس کام سے روکا جائے قصداً وہی کرتے ہیں اور خیر کی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ شر اس قدر غالب ہے کہ اس کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتے اور سفلی حرکات کے شوق میں بڑھ چڑھ کر بازی لے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ سیاہ بختی نافرمانی کی سزا میں ان کے لیے مقرر کر دی گئی ہے اور اب وہ اسی نہج پر خلقِ خدا کو بھی ورغلاتے اور بہکاتے رہیں گے۔

ساتویں طبقے میں فقیر نے ایذا دینے والے ایسے شیاطین دیکھے جن کے آس پاس عقرب اور مار تھے۔ ان کی جسامت اور ہیبت بیان سے باہر ہے۔ چٹانوں سے بڑھ کر قوی الجثہ اور اس قدر وسیع الجثہ کہ دھرتی پر ان کی موجودگی عذابِ الٰہی کا اشارہ ہے۔ گویا جہنم کا ایک نقشہ فردوس کے تضاد میں زمین پر گرا ہوا ہے۔ ربّ کریم نے اپنی حکمت سے کرۂ ارض پر جنت و دوزخ کے نمونے بطور عبرت و رغبت یوں رکھے کہ

توازن پر زائر کے منہ سے کہیں سبحان اللہ نکلتا ہے تو کہیں 'استغفر اللہ' کی صدا بے اختیار لبوں سے پھوٹ پڑتی ہے۔ بے شک وہ نعیم اور جحیم کا خالق، مالک اور مختار ہے اور ہر شے اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ سالک کے لیے اس نکتے میں یہ سبق ہے کہ قہار و جبار اور ستار و غفار مالک کی شانِ بے نیازی کے مناظر دیکھے اور ریاضت و مشاہدہ اور عبادت و مجاہدہ میں اضافے کے لیے استعداد بڑھائے۔

زائر نے تحت الثریٰ تک مناظر کی سیر کی اور وہ مخلوقات دیکھیں جن کی ہیبت سے انسان کا دم نکل جائے مگر سالک پر نگاہِ شیخ مہربان ہو تو تائیدِ الٰہی کی بدولت وہ زمرۂ لاتحزنوں میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اس پر کوئی خوف، سوائے اللہ کے، نہیں ہوتا۔ مظاہر کی ہیبت اسے تسبیح کی ترغیب دیتی ہے اور ان کی ہولناکی عجائب سے دلچسپی میں بدل جاتی ہے۔ زمینوں کی سیر کے دوران عجیب کیفیات طاری ہوتی ہیں اور نکتے لُطفِ الٰہی کے سبب کھلنے لگتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی یہ عظمت زائر پر اس لیے منکشف ہوتی ہے کہ وہ جلالت کے اسرار پا سکے۔ بے شک وہ معبود ہے اور ہم بندے۔ اپنے خالق کی بندگی ہماری ضرورت اور پہچان ہے اور یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں صراطِ مستقیم سے آشنا کیا اور بہترین صورت پر خلق فرمایا۔ سو اب انسان پر لازم ہے کہ وہ رشکِ ملائکہ بنے، بندگی کا شوق بڑھائے اور فرائض پر توجہ مرکوز رکھے کہ اس 'غفار الذنوب' کا دریائے کرم اپنے بندے کی عبادت و ریاضت کے صدقے گنہگاروں کی معصیت کو بھی دھو ڈالتا ہے اور یوں سیراب کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی حاجت نہیں رہتی۔ مومن کی اصل شان ہی یہ ہے کہ غیر اللہ کا تصور محو ہو جائے اور روح و قلب، بدن کی رفاقت میں اسی کی جانب جھکیں جو کاشف القلوب بھی ہے اور خالقِ روح و بدن بھی۔

فقیر نے زمینوں کے اسرار جس تفصیل سے مشاہدہ کیے انھیں اتنی صراحت سے بیان نہیں کیا کہ اذن سے تجاوز نافرمانی ہے۔ یوں بھی ہر قاری اور سالک کسی کی روحانی مسافت کی تصدیق و تائید کا اہل نہیں ہوتا۔ قارئین ہدایت، نفع اور اپنے اطمینان و تسلی کے لیے اہلِ علم اور اہل اللہ کی معروف تصانیف دیکھیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ فقیر نے گرچہ تشنگی نہیں رہنے دی پھر بھی بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ اس اظہار میں بوجھل اصطلاحوں سے قصداً گریز کیا ہے تا کہ قاری کو مفہوم تک رسائی میں آسانی ہو مگر صاحبانِ توفیق کتبِ مُسافت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے حضرت باغ حسین کمالؒ نے اپنی تصنیف 'حالِ سفر' ص ۹۲ پر حضرت امام غزالیؒ کی یہ تحریر نقل کی ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ عالمِ بیداری میں بھی اگر کوئی شخص ریاضت و مجاہدہ سے کام لے اور دل کو غصہ و شہوت اور اخلاقِ بد کے جنگل میں نہ پھنسنے دے۔ اس جہاں سے روگرداں ہو کر گوشۂ خلوت اختیار کر لے، آنکھیں بند کر لے اور حواس کو معطل کر دے اور دل کی عالمِ ملکوت سے مناسبت پیدا کرے اور وہ یوں کہ ہمیشہ اور مسلسل زبان کی بجائے دل سے اللہ اللہ کہا کرے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جائے اور سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے کسی چیز کی سُدھ بُدھ نہ رہے، تو خواہ وہ بیدار ہی کیوں نہ ہو، روزنِ دل اس پر کشادہ رہے گا اور جو کچھ دوسرے لوگ خواب میں دیکھتے ہیں وہ اسے بیداری میں دیکھے گا اور ارواحِ نیک اور فرشتے اسے حسین و جمیل صورتوں میں دکھائی دینے لگیں گے۔ ایسا شخص پیغمبروں کو بھی دیکھنے لگتا ہے اور ان سے فوائد حاصل کرتا ہے اور ان کی امداد سے مشرف ہوتا ہے اور فرشتے زمین و آسمان کے ہر گوشے کو اس پر

بے نقاب کر دیتے ہیں اور جس شخص پر یہ راز کھل جائے اس سے کارہائے عظیم دیکھنے میں آتے ہیں یہاں تک کہ ان کی صفت کرنا محال ہے۔" (کیمیائے سعادت، ص ۸۱)

ایک خوش بخت ساعت تھی کہ یہ عاجز برزخ میں تھا۔ زمینوں اور آسمانوں کے درمیان ربّ العالمین کے عجائبات میں سے برزخ ایک ایسا مقام ہے جہاں ارواح قیام پذیر ہیں اور پروردگارِ عالم کے پسندیدہ اعمال کی انجام دہی میں مصروفِ عمل رہتی ہیں، بے شک اللہ ہی عزت عطا کرنے والا ہے۔ وہاں کے اہل اور بزرگ اپنائیت سے ملے اور محبت و شفقت کا اظہار فرمایا۔ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے بغل گیر ہو کر فرمایا...... ''یہاں آپ کے استقبال کی تیاریاں اتنی قابلِ رشک تھیں کہ ہم سب بہت مشتاق تھے۔'' عرض کیا'' یہ سب رضائے ربانی، عطائے محبوبِ سبحانیؒ، دعائے شیخِ محترم اور آپ بزرگوں کی شفقتوں کا صدقہ ہے۔'' اتنے میں ایک انتہائی نورانی صورت بزرگ آگے تشریف لائے اور یوں ملے جیسے صدیوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔ اُن کے ساتھ دو اور ہستیاں بھی تھیں۔ انھوں نے فرمایا...... ''میں حاجی احمد ہیلانی

ہوں اور یہ آپ کے بابا جی حافظ خان محمدؒ ہیں۔'' دوسرے بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ''یہ قاضی عبدالحلیم ہیں۔'' عرض کی...... ''ان کا ذکرِ خیر تو اکثر خاندانی محفلوں کی زینت رہتا ہے اور سب آپؒ کا کلام سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔'' تینوں ہستیوں نے شفقتیں نچھاور فرماتے ہوئے کچھ اور خاندانی بزرگوں سے بھی ملاقات کروائی۔ بابا جی خان محمدؒ نے نمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے فرمایا ''بیٹے ہماری دعا ہے کہ اللہ آپ جیسی اولاد سب کو عطا کرے۔'' میں نے عقیدت و مسرت سے لبریز دل کے ساتھ...... ''ما پروردۂ یک نو بہاریم'' کہتے ہوئے تمام بزرگوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہیلانی کی وجہ تسمیہ دریافت کی تو حضرت حاجی احمدؒ نے فرمایا ''بیٹا ہیل عراق میں ایک قصبہ ہے وہاں ہمارے اجداد کا قیام رہا ہے اس نسبت سے ہیلانی ہوں۔''

معاً دیکھا کہ ایک جلسے میں ہوں۔ ہر طرف سے پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جارہی ہیں اور انوارات مجھے دائرے میں لیے ہوئے ہیں۔ میرے ہونٹ شوقِ اظہار میں لرزے اور کہا...... ''اس لطف و کرم کے لیے آپ حضرات کا شکر گزار ہوں۔'' پھر فقیر نے ان بزرگان کو ڈیوٹیاں تفویض کیں اور ملتمس ہوا .... ''ہم سب دربارِ اقدس ﷺ میں جوابدہ ہیں اور معاملات کی نوعیت و حساسیت آپ پر واضح ہے۔ ''سب نے اس منزل کے قبل از وقت سر ہو جانے کے حوالے سے تعاون کا یقین دلایا، دُعاؤں سے نوازا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؓ اور حضرت جیؒ کی مشاورت سے حضرت جنید بغدادیؒ کو برزخ کمیٹی کی سربراہی سونپ دی گئی۔ انھوں نے وعدہ فرمایا'' کام اگرچہ مشکل ہے مگر اللہ کے کرم سے بروقت ہو جائے گا۔'' سالک کو جاننا چاہیے کہ دنیا کے امور اختیاری ہیں جبکہ برزخ کے ضروری جن کی

انجام دہی بہر صورت لازمی ہے اور ان کے حوالے سے تغافل نہیں برتا جا سکتا۔ فقیر نے ضروری کام انجام دیے تو آگے لے جایا گیا۔

یوں تو میرے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ ہر پل میرے رہبر اور ہر گام رہنما ہیں مگر خاص طور پر برزخ میں اکثر بزرگوں سے تعارف انہی کے فیض و کرم کا نتیجہ تھا۔ آپؒ نے فرداً فرداً تمام ہستیوں سے ملاقات کروائی۔ ایک مقام پر دیکھا کہ بہت سے روحانی ایک مقدس ہستی کے گرد جمع ہو کر ان کے فرمودات سنتے اور لکھتے جاتے ہیں۔ میں بھی حضرت جیؒ کی معیّت میں آگے بڑھا تاکہ ارشادات سے مستفید ہو سکوں۔ میرِ مجلس نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور مسکرا کر استقبال کیا۔ مسافر عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے عرض گزار ہوا ''میں اپنی خوش بختی پہ نازاں ہوں کہ اللہ کریم نے مجھے راویوں کے امام اور اصحابِ صفّہ کے جوہر کی زیارت کا موقع عطا کیا۔ اے حضرت ابو ہریرہؓ! مجھ عاجز کو بھی اس علم کی فہم کا کوئی نکتہ تعلیم کیجیے۔''

میری گزارش پر فرمایا..... ''بے شک نسبت جو ہر شناس ہوتی ہے۔ حضرت اویس قرنیؒ نے آپ کو عشق اور حضرت باغ حسین کمالؒ نے علم سے آراستہ کیا۔ علم اور عشق کا ملاپ ہی رسول ﷺ کی قربت کا ذریعہ ہے۔ مجھے اس ملاقات کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ الحمد للہ آپ نے عین معرفت سے مجھے پہچانا۔'' پھر فرمایا........

''عرب کے لوگ قبل از اسلام بھی لفظِ حدیث کو 'خبر دینا' کے معنوں میں استعمال کرتے تھے اور عربی کا محاورہ ہے صار حدیثا یعنی فلاں شے ضرب المثل ہو گئی۔ قرآنِ کریم کی سورۃ 'زمر' میں حدیث کا لفظ 'کلام' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اللہ نزل احسن الحدیث کتبا متشابھا مثانی (۲۳)

''اللہ نے بہترین کلام نازل کیا (یعنی) ایک کتاب جس کی آیتیں

ملتی جلتی، بار بار دہرائی گئی ہیں۔"

یاد رکھیں کہ حدیث کی کئی اقسام ہیں جیسے موضوع، صحیح، حسن، ضعیف، مرفوع وغیرہ۔ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی شمالی عرب کے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور مکہ مکرّمہ تو تجارتی مرکز تھا اس لیے وہاں مدینہ منورہ سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے۔ عرب کے باسیوں کو قرآنِ کریم میں اُمّی ان پڑھ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ سے دوری کے باعث کہا گیا۔ حضورﷺ کو نبی الامّی اسی لیے فرمایا گیا کہ آپؐ اُن اُمّیوں کے درمیان اُتارے گئے۔"

حضرت ابوہریرہؓ نے یہ بھی فرمایا..... "حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ کا صحیفہ صادق اور وہ جو میں نے حضرت ہمام بن مُنبّہؒ کو نقل کروایا تھا امّتِ مسلمہ کی متاع ہیں۔" میں نے عرض کیا "حضرت ہمامؒ کے صحیفۂ صحیح میں بہت کم احادیث ہیں اور دریافت بھی بہت تاخیر سے ہوا، اس کی کیا وجوہات ہیں؟"

آپؓ نے فرمایا..... "ایک تو ہمامؒ میرے پاس بہت دیر میں آئے۔ دوسرا یہ کہ ان کے نصیب میں اتنا ہی حصّہ تھا جو بہرحال بہت بڑی نعمت ہے۔" مزید فرمایا..... "جمعِ حدیث کا کام رسالت مآبﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں آغاز ہو گیا تھا اور میرے علاوہ حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور دیگر کئی اصحاب نے صحت کے ساتھ حضورِ اقدسﷺ کے ارشادات جمع کیے، یاد رکھے اور لوگوں تک پہنچائے۔"

اس کے بعد امام الرّاویان نے حدیث شریف کے کچھ خاص نکتے عطا فرمائے اور ایک حدیثِ مبارکہ بطورِ خاص سنائی:

قال رسول الله :من اشد اُمّی لی حبا، ناس یکونون بعدی،یود احدھم لورانی، ما ھله ما له (مسندِ احمد، مسلم)

''نبی کریمؐ نے فرمایا میری اُمت میں سے میرے ساتھ شدید محبت کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے اور اُن میں سے ہر ایک کی تمنّا ہوگی کہ کاش وہ اپنے سب اہل وعیال اور مال و اسباب کے بدلے میں مجھے دیکھ لیں۔''

میں نے عرض کی...... ''بے شک مُسلمان کا سب سے بڑا اور قیمتی اثاثہ عشقِ الٰہی اور حُبِ رسولؐ ہے۔'' نہایت شفقت سے فرمایا'' آپ کو اجازت ہے کہ جسے اہل جانیں اسے مخصوص احادیث کا اذن بطور وظیفہ دے سکتے ہیں۔'' فقیر نے اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے آگے روانہ ہوا۔

ضروری ہے کہ یہاں اپنے قاری کی معلومات کے لیے ایک دو باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔ ایک تو یہ کہ اہلِ عرب ہر قول کو حدیث کہا کرتے تھے۔ لہٰذا آپؐ نے قرآنِ کریم کو، جو بے شک قدیم ہے، الگ سے بلند مرتبہ قرار دیا اور اپنے فرمودات کو لفظِ حدیث سے تعبیر کرنا پسند فرمایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ صحیفۂ ہمامؒ کی تلاش میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بڑی جانکاہی سے کام لیا اور اللہ کے فضل سے کامیاب ٹھہرے۔ مرحوم کو اس کے دو مخطوطے دمشق اور برلن سے ملے تھے اور دونوں میں سرِ مُو فرق نہیں تھا۔ اس کو مزید سند اس وقت ملی جب دیکھا گیا کہ صحیفۂ مذکورہ کا تمام مواد مسندِ احمد میں موجود ہے اور کچھ احادیث امام بخاریؒ کی صحیح میں بھی شامل ہیں۔

یقیناً حضرت حمید اللہؒ کی محنت اور تلاش سراہے جانے کے لائق ہے لیکن اس خیال کی صحت سے اختلاف ہے کہ یہ صحیفہ ۱۵۱ ہجری میں مرتب ہوا کیونکہ 'علوم الحدیث'

کے مصنف ڈاکٹر صبحی صالح (لبنان) نے پوری ذمہ داری سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ہمامؒ ۱۳۱ہجری میں واصلِ حق ہوئے جبکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات ۵۸ہجری میں ہوئی۔ یوں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ مخطوطہ ۵۸ہجری سے پہلے نقل ہوا جب حضرت ہمامؒ کی عمرِ مبارک ۱۶ / ۱۵برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ہوسکتا ہے انھوں نے بعد میں اضافے بھی کیے ہوں لیکن ۱۵۱ہجری بہرحال درست نہیں۔ یاد رہے کہ حضرت ہمامؒ بن مُنبّہ ۴۰ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بعد فقیر اُن اصحابِ کبارؓ اور تابعین سے ملا جو حدیث وفقہ میں یکتائے روزگار ہیں۔ سب نے ہمت افزائی کی اور دُعا فرمائی۔ ایک ملاقات ایسی تھی جس کی یاد ہر آن آنکھوں میں بسی رہتی ہے اور لگتا ہے جیسے ابھی ابھی ان سے رخصت لے کر آیا ہوں۔ اس دستِ شفقت کا لمس ابھی تک اپنے شانے پر محسوس ہوتا ہے، اللہ اسے برقرار رکھے۔ یہ منظر امام الفقہاء حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات کا ہے۔ فقیر نے دیکھا کہ اہلِ برزخ ایک نورانی ہستی کے پاس آتے ہیں اور طرح طرح کے مسائل دریافت کرتے ہیں۔ کوئی فقہ سے متعلق مسئلہ پوچھتا ہے تو کوئی موضوع حدیثوں کے حوالے سے سوال کرتا ہے۔ حضرت جیؒ مجھے لے کر ان کی جانب بڑھے تو انھوں نے کھڑے ہو کر مجھ سے معانقہ فرمایا۔

حضرت جیؒ نے فرمایا...... "بیٹے آپ خوش بخت ہیں کہ امام اعظم حضرت نعمان بن ثابتؒ المعروف امام ابوحنیفہؒ سے شرفِ ملاقات حاصل کر رہے ہیں۔" میں تعظیماً جھکا تو انھوں نے نہایت شفقت سے اپنے پہلو میں بٹھانا چاہا۔ میں متردّد تھا کہ حضرت جیؒ بھی تشریف فرما ہوں تو بیٹھوں۔ یہ دیکھ کر اُنہوں نے فرمایا..... "کمال صاحب کو ایک کام کے سلسلے میں آگے جانا ہے اس لیے آپ تشریف رکھیں۔"

میں حضرت جیؒ کی آنکھوں کا اشارہ پا کر بیٹھ گیا تو آپؒ کہیں تشریف لے گئے۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا..... ''بے شک آپؒ ہی کے لیے رسول کریم ﷺ کے روضہ اطہر سے ''امام المسلمین'' کی صدا آئی تھی۔ اے امام الفقہاء! مجھے بھی کچھ تعلیم فرمائیے۔'' جواباً فرمایا..... ''بیٹے فقہ اور فہم میں فرق ہے۔ فہم صرف سمجھ ہے جب کہ فقہ کا مطلب ہے گہری فکر۔ ایسا تعقل جو قول اور فعل کی گہرائی تک جا کر ان کا تجزیہ کرے اور یہ بہت مشکل رستہ ہے۔ ابو جعفر منصور نے بہت کوشش کی کہ مجھے قاضی بنائے۔ الحمدللہ میں نے نکیل پسند نہیں کی۔''

عرض کی...... ''دورانِ اسیری حضرتؒ کے جسدِ پاک پر کوڑوں کے نشان بنانے والوں کو کہاں اندازہ تھا کہ آنے والی صدیاں فقہ حنفی کی روشنی سے منوّر ہوں گی۔'' میں نے کنیت کے بارے میں تصدیق کرنا چاہی تو بتایا.... ''اس کنیت کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو اپنی پیاری بیٹی کا اثر اور اس کی فرمائش جبکہ دوسری زیادہ اہم وجہ ''دینِ حنیف'' ہے کہ اللہ نے ہمیں یہ دین عنایت فرما کر اس کی حفاظت کا فرض سونپا۔'' میں نے تائیداً عرض کی.... ''بے شک دینِ حنیف کا علمی وقار اور شان بڑھانے پر ابوحنیفہ کی کنیت آپؒ ہی کو زیب دیتی ہے۔ فقہ کے اصولوں کا تعین جس طرح آپؒ نے کیا یقیناً وہ سعادت کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔''

امامِ اعظمؒ نے فرمایا............ ''آپ کے نمازی متوسلین کو مُبارک ہو کہ اتباعِ شریعہ کے باعث انھیں دولتِ عشق نصیب ہوتی ہے اور وہ سفلی مخلوقات سے محفوظ رہتے ہیں۔ میری طرف سے اسمِ ربانی ''القوی'' کے وظیفے کا اذن قبول کریں۔'' اس کے بعد حضرتؒ نے اپنی نسبت عطا فرماتے ہوئے اجازت دی کہ جب چاہوں ان سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ فقیر شکریہ کے ساتھ امام شافعیؒ کا یہ قول پڑھتا

ہوا رخصت ہوا...... "سب لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے محتاج ہیں۔"

برزخ ارواح کی عارضی قیام گاہ ہے، یہ کوئی مستقل مقام نہیں۔ یہاں قیام پذیر ارواح انہی اعمال پر قائم ہیں جو وہ دنیا میں انجام دیتی رہیں یعنی مومن، یہاں بھی مومن ہے اور مشرک، زمین کی طرح یہاں بھی شرک پر قائم۔ برزخ اور آسمانوں میں قیام کے دوران روح پر گرانی کا احساس نہیں ہوتا، ایمان ہلکورے لیتا ہے اور ربِ کریم کی عظمت وجلالت ہر دم روح کو شادمان رکھتی ہے۔ یاد رہے کہ روح سبک ترین ہے، بوجھ میں خوشبو سے بھی ہلکی لیکن مرتبے اور فضیلت میں انسانی فہم وادراک سے ماورا۔ مادی اعتبار سے حیاتِ انسانی صرف 'جسم' سے عبارت ہے جس کی مشینری طبعی قوانین کے ماتحت سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اس کا رکنا موت کہلاتا ہے اور یوں ایک فرد حال سے ماضی کا قصہ بن جاتا ہے۔ لیکن اسلامی تصورِ حیات کی رُو سے انسان "جسم" اور "روح" کا امتزاج ہے۔ روح طبعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی۔ بالفرض اگر ان قوانین کے مطابق یہ مشینری حرکت کرنے کے قابل نہ رہے تو بھی روح پہ کچھ اثر نہیں پڑتا اور وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ روح جوہرِ اصلی اور غیر فانی ہے جسے بالآخر اپنی حقیقت کی سمت جا کر اس کا جزو ہونا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں روح کل میں سما کر سرشار ہو جاتی ہے۔ بقول غالب:

ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

گویا برزخ ایک ٹرانزٹ کیمپ (Transit Camp) ہے جہاں تمام ارواح اس امر کی منتظر ہیں کہ کب قیامت قائم ہو اور ان کا فیصلہ اعمال کے مطابق کیا جائے۔ بالکل ایسے ہی جیسے طالب علم امتحانات کے بعد اعلانِ نتائج کا انتظار کرتے ہیں۔ برزخ میں پاکیزہ روحوں کا انتظار خوف اور بے تابی کا باعث نہیں بلکہ وہ یہاں بھی

حسبِ سابق عبادت و ریاضت اور مجاہدات میں مشغول ہیں جبکہ گناہگار یہاں خوف میں مبتلا ہیں اور انھیں عذاب کا سامنا ہے۔ اگر چہ یہ عذاب دوزخ کے عذاب سے بہت کم درجہ ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ نُور اور نار کے اسرار اس مقام پر سالک کو دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف نماز اور ذکر جاری ہے تو دوسری جانب غم و آلام کا سلسلہ۔

برزخ کی زندگی ہماری دنیاوی زندگی سے یکسر مختلف ہے۔ عالمِ ارض سے برزخ میں آنے والی ارواح جسمانی آلائشوں سے نکل کر ایسے عالم میں داخل ہو جاتی ہیں جہاں جسد و خاک کا گزر نہیں۔ یہاں روحانی سطح پر زندگی سے معاملہ ہوتا ہے اور سالک کو بالیدگیٔ نفس کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ارواح کی اصل یعنی ان کی دنیاوی پہچان صرف اولیاء ہی کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک برزخ میں صرف انہی روحوں کا قیام ہے جو دنیا سے موت کے بعد منتقل ہوئیں حالانکہ ایسا نہیں، برزخ میں دیگر مخلوقات اور اقوام بھی مکیں ہیں جو اہلِ آخرت میں سے ہیں۔ ایمان کا حامل ہی ان سے انس رکھتا ہے اور وہ بھی فوراً اس کی جانب ملتفت ہوتے، عبادات میں اس کی ہمت بندھاتے، خالقِ کائنات کی شان بیان کرتے اور حُب اللہ کی لَو بڑھاتے ہیں۔ ان کی مجلس بہت پُر لطف اور عنایاتِ الٰہی کا سبب ہوتی ہے۔ وہ ایک عاصی کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوتے۔ سیاہ کار کے ساتھ معاملہ کرنے والے ایسی مکروہ صورتوں میں ہوتے ہیں گویا گناہ مجسّم ہو کر آنکھوں کے سامنے آ گیا ہو۔ وہ گناہ گاروں کی طرف بُری صورت لے کر جاتے ہیں اور انھیں اُن کرتوتوں کی یاد دلاتے ہیں جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔

فقیر کو بتایا گیا کہ یومِ حساب کے بعد جب سب کی فردیں دے دی جائیں گی تو یہ عالم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے گا۔ مومن جنت میں مستقلاً ان مقامات پر

فائز ہو جائیں گے جو ان کے لیے مخصوص ہیں اور اہلِ دوزخ دائم ان عذابوں میں گھرے رہیں گے جو اعمالِ قبیحہ کی وجہ سے ان پر مسلّط ہوں گے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ سے اجازت لے کر رخصت ہوا تو دیکھا کہ ایک طرف سے قالَ رسولؐ کی مبارک صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک بزرگ نُور کے حصار میں گھرے کچھ بیان فرما رہے تھے اور لوگ، سُبحان اللہ، لبیک یا رسول اللہ، اَحسنت مرحبا جیسے کلمات جواب میں بلند کرتے تھے۔ فقیر بھی ایک صاحب کی اجازت سے اس مجمع میں بیٹھنے لگا تو خطیب نے اشارے سے آگے بُلا لیا اور پہلو میں بیٹھنے کے لیے انگشتِ مبارک ہلائی۔ میں نے تعمیل کی تو انھوں نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔ یوں کافی دیر گزر گئی۔ محفل برخاست ہونے پر سب رخصت ہوئے تو میں نے عرض کی..... ''بے شک دنیا کو فنا ہے اور ہمارے مستقل قیام کا فیصلہ یومِ حساب میں ہوگا۔ ہر شے کو اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہے۔

بای خدیك تبدی البلا

وبای عینك ماذا السلا

''کون سا چہرہ ہے جو مٹی میں نہیں ملا اور کون سی آنکھ ہے جو بہ کر زمین پر نہیں ٹپکی۔''

......ہم نے آپؒ کا زمانہ نہیں پایا لیکن یہ اللہ کا فضل ہے کہ اب آپؒ کی زیارت ہوگئی۔ میں اپنے شیخؒ کے اس ارشاد پر دل و جان سے یقین رکھتا ہوں کہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بخاریؒ امام الآئمہ فی الحدیث ہیں اور محدثین کے لیے آفتابِ ہدایت۔ آپؒ کے علم و معرفت نے عشق و احتیاط کا حسین امتزاج پیش کیا۔ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ یہ سب برکت آپ کی کنّیت ابوعبداللہ کی وجہ سے ہے۔''میری بات

سماعت فرما کر امام بخاریؒ مسکرائے اور فرمایا...... "بیٹے عشق وہ نکتے بھی سمجھا دیتا ہے جو ساری عمر مخفی رہتے ہیں۔ یہ نکتہ آفرینی مبارک ہو۔ اس بات کی خوشی ہے کہ اللہ نے یہ نام ذہن میں ڈال دیا اور میری اولاد کو بھی نبی کریمؐ کے والد گرامی حضرت عبداللہ کے اسمِ پاک سے سربلند کیا...... آپ سے ملاقات یوں بھی باعثِ فرحت ہے کہ عشق بہرحال افضل و محترم ہے۔" پھر دریافت فرمایا..... "حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی 'فتح الباری' نظر سے گزری ہے۔" عرض کی "حضرت یہ عاجز زبانوں کی معرفت میں ایک طالب سے زیادہ درجہ نہیں رکھتا البتہ حافظؒ کی شرح ہی وجہِ شوق بنی اور اسی سے میں نے جانا کہ فقہ میں بھی آپؒ کا مقام بہت بلند ہے۔"

غرض امام بخاریؒ نے بہت سے انعامات سے نوازا اور حدیث شریف 'انما الاعمال بالنیات' کا وظیفہ بھی اجازت کے ساتھ عنایت کیا۔ راقم اسے اپنی سرفرازی خیال کرتا ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث نے میری درخواست پر عالمِ اسلام اور خصوصاً پاکستانی علمائے کرام کے لیے دُعا فرمائی اور میرے مشن کے حوالے سے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے فرمایا کہ جب چاہوں رابطہ کرلوں۔ پھر خاص طور پر تاکید فرمائی..... "اگر آپ کے کسی متوسّل کو طلبِ حدیث کا شوق ہو تو ان احادیث کا خیال رکھے جو فقہا، علمائے اصول، علمائے نحو، محدثین اور عوام میں معروف ہیں۔ بعض ایسی ہیں جو بیک وقت مشہور ہیں۔" بعد میں ان ارشادات کو میں نے مختلف کتب میں مرقوم پایا تو کلماتِ شکر ادا کیے۔ ڈاکٹر صبحی صالح نے ان احادیث کے متعلق یوں لکھا ہے:

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق یعنی فقہا میں مشہور۔

رفع عن امتی الخطاوالنسیان وما استکرہ علیہ، اصولی علماء میں معروف۔

من سلم المسرفون من لسانه ويده ، بیک وقت علمائے محدثین اور عوام میں مشہور۔

نعم العبد صهيب، عوام میں مقبول۔

قرآنِ کریم کی آیات پر غور و تفکّر کیا جائے تو عیاں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو واضح طور پر دو طبقوں میں دیکھ کر اہلِ ایمان اور منکرین کا نام دیا۔ ایک وہ ہیں جو سب کچھ دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے باوجود ''میں نہ مانوں'' کی روش پر قائم ہیں۔ ان کے دلوں، آنکھوں اور کانوں پر مہریں ثبت ہیں اور کوئی دلیل ان کیلیے قابلِ قبول نہیں۔ وہ خدا کی نشانیوں سے اس کے ہونے کی گواہی نہیں لیتے یہاں تک کہ انبیاء و رُسل کے انکاری ہیں۔ قرآنِ کریم انھیں فسادی، ظالم، منکر، مشرک اور کافر قرار دیتا ہے۔ یہی لوگ فساد فی الارض کا باعث بنتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کے بدلے میں انھیں ایک روز اس عذاب کا سامنا ہوگا جو دنیا کے عذاب سے بہت بڑا، سخت کڑا اور نا مختتم ہے۔ غافلین کو 'سورۃ ق' میں خبردار کیا گیا ہے کہ جب قیامت کے دن ان کی آنکھوں سے پردے ہٹیں گے تو عذاب ان کے لیے تیار ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

فكشفنا عنك غطآءك فبصرك اليوم حديد (ق۔۲۲)

''اب ہم نے تیرے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔''

یعنی اب غفلت کا نتیجہ بھگت اور نہ ماننے والے دل اور آنکھوں کو رو۔ راقم نے برزخ میں ایسے گروہ کا بھی تذکرہ کیا ہے جو وہاں پچھتاوے میں بری طرح مبتلا اور خوفزدہ ہے۔ مذکورہ آیت میں اسی طبقے کو مخاطب کیا گیا ہے۔

دوسرے وہ اہلِ ایمان ہیں جن کا ہر قول و فعل صرف اور صرف خوشنودیٔ باری تعالیٰ اور رضائے الٰہی کے لیے ہے۔ وہ ہر عمل اس کی خوشی کے لیے سرانجام دیتے ہیں اور

جانتے ہیں کہ وہ بہر حال ہمیں دیکھ رہا ہے۔ انھیں اللہ کے سوا کسی کی حاجت نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی ذات ان کے خیال و خواب میں ہے۔ ان کی روز مرّہ زندگی اور شَب و روز کا ہر عمل عین عبادت کے زمرے میں داخل ہے۔ وہ محبوب کو روشنی کا سفیر مانتے ہوئے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جہاں اس کا ٹھکانہ ہو وہاں چراغ کی حاجت نہیں رہتی۔ ایسے لوگ بے شک کامیاب و کامگار ہیں اور اُسی رُخ سے نُور کشید کرتے ہیں جس کی قیام گاہ صرف مومن کا دل ہے۔ ایسا دل جو نُورِ اللہ اور نورِ محمد ﷺ سے تابندہ رہتا ہے۔ یوں جب ایک مومن کے نہاں خانۂ دل سے غیر کا پرتو تک مٹ جاتا ہے تو اسے حجابات اٹھتے محسوس ہوتے ہیں اور چہار سُو 'اللہ ہی اللہ' کا ظہور دعوتِ نظارہ دینے لگتا ہے۔

یاد رہے کہ تصوف کی بنیاد استدلالِ فکر نہیں، روحانی فکر ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ریاضی کے کتنے سوالات اور معمے ہیں جنھیں ہر شخص حل نہیں کر سکتا۔ بس کچھ لوگ ہیں جنھیں یہ علم ودیعت ہوا ہے اور وہ صحیح جوابات تک رسائی رکھتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی دوسرا انھیں حل نہ کر سکے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان سوالات کی بنیاد غلط ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی کے لیے ریاضیاتی اور سائنسی استدلال ہرگز کام نہیں آ سکتا کیونکہ یہ استدلال صرف معلوم پر قائم ہے اور تمام موجود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ایسا قطعاً نہیں کہ سارا موجود سائنس اور ریاضی کا معلوم ہو۔ ہم آئے دن نئی نئی دریافتوں اور ایجادات کے بارے میں سنتے ہیں اور زندگی میں ان کا تجربہ کرتے ہیں جو ہمارے لیے محض ہماری لاعلمی کے باعث پہلے موجود نہیں ہوتیں۔ چند دہائیاں قبل سائنسدانوں نے بگ بینگ (Big Bang) اور بلیک ہول (Black Hole) کا تصور دیا اور یہ کام بھی ابھی نظری سطح پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجود آہستہ آہستہ علم کے

ذریعے معلوم بن رہا ہے۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل سائنس دان اپنی معلوم کہکشاں (Milky Way) کو ہی کل کائنات سمجھتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ رہی ہے کہ اس وقت کائنات اربوں پختہ (Mature) کہکشاؤں کے ایک پائیدار اور مربوط نظام پر مشتمل ہے اور بے شمار دیگر کہکشائیں ابھی تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہیں۔ کائنات میں کہکشاؤں کی مختلف اقسام، عمر اور ادوار اس بات کی دلیل ہیں کہ کائنات ابھی نامکمل ہے اور شاید ہمیشہ ارتقاء پذیر ہی رہے گی، نئی کہکشائیں وجود میں آتی رہیں گی اور ان میں نئے سورج اگتے رہیں گے۔ بقول اقبال:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

صوفی کے نزدیک علم کی انتہا دیدارِ الٰہی ہے۔ روحانی استدلال اپنی اساس میں زیادہ عقلی ہے اور تجربے کی اس سطح تک لے جاتا ہے جہاں ماسوا اور غیر کا تصور ہی نہیں۔ یہ ٹکڑوں میں بٹا ہوا اور ریزگی کا شکار نہیں بلکہ حقیقت کا کلّی تصور پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس محض استدلال کی بنیاد پر استوار فکر سے آوارگی اور شکستگی آشکار ہوتی ہے۔

تصوف نباتات، حیوانات، جمادات اور دیگر انواع کو الگ سمجھنے کے باوجود ان کے مرکز تک پہنچتا ہے اور بتاتا ہے کہ تمام مظاہر اور مخلوقات ایک ہی کُل کا پرتو ہیں مگر یوں کہ ان کے تقسیم ہونے سے کُل کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب تو ایٹمی توانائی کی تقسیم در تقسیم نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ ذرّہ چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اتنی ہی توانائی رکھتا ہے جتنی تقسیم ہونے سے قبل اس میں تھی لیکن مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اس راز کی پردہ کشائی کے بعد بھی عقلیت پسند، جوہر کی بنیاد تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔

روحانی یا صوفیانہ استدلال پُوری سلامت روی کے ساتھ حقیقت کا وہ تصور پیش کرتا ہے جسے عشق کے علاوہ کسی لیبارٹری تجزیے کی ضرورت نہیں۔ جب سالک اپنا ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دے کر بیعت سے ہمکنار ہوتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ باطنی پاکیزگی اور حقیقتِ اعلیٰ سے کیا مُراد ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو ساری عمر عقلی علوم کے پیچھے ہی بھاگتے رہتے ہیں اور آخر میں انھیں معلوم ہوتا ہے کہ سراب دُور ہی سے پانی نظر آتا ہے۔ بھلا ایسے لوگ کیا جانیں کہ زمین و آسمان میں وقت کن روشوں پر چلتا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ جب محبوب اور محبّ ملتے ہیں تو وقت کہیں دور اور بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ بقول حضرت جیؒ:

دور پیچھے رہ گئی تھی وقت کی رفتار بھی
میں مکاں کو چھوڑ کر جب لامکاں کو چل پڑا

وصال کا عمل ایسا ہے کہ زمان و مکاں کی قید باقی نہیں رہتی، من وتُو کا فرق تمام اور عکس و آئینہ کی دُوئی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ وصال ہے اتصال نہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے ایک واقعہ پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ کچھ عرصہ قبل اسلام آباد سے ایک یونیورسٹی کے چند طلبا و طالبات میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم وقت کی تھیوری کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے مُسلم اور غیر مُسلم مفکرین اور دانشوروں کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ ان کے نظریات سے ہماری تشفّی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو نمازِ عصر ادا کر لیں تاکہ فرض کی ادائیگی کے بعد اطمینان سے بات ہو سکے۔ طالبات کے لیے پردے میں نماز پڑھنے کا اہتمام کیا گیا۔ نماز کے بعد اُن سے پوچھا..... ''کیا آپ کسی ایسی ہستی کے متعلق بتا سکتے ہیں جو ہر

جگہ موجود ہو۔'' کہنے لگے ''یقیناً اللہ ہر جا ہے۔''میں نے سوال کیا..... ''اس وقت یہاں پیر ودھائی میں سوا چار بجے ہیں (یہ ملاقات پیر ودھائی، راولپنڈی میں ہوئی تھی) جبکہ برطانیہ میں بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ کیا اللہ تعالیٰ وہاں بھی موجود نہیں۔'' اس پر وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے کہا..... ''اللہ تعالیٰ وہاں بھی ہے جہاں مہینوں تک رات ہی رہتی ہے اور وہاں بھی جہاں دن طویل ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ انسانوں کے بنائے ہوئے تصورِ وقت سے بے نیاز ہے جبکہ ہم نہیں'' کہنے لگے ''بے شک۔'' پھر ان سے دریافت کیا..... ''یہ ایک بجے، چار بجے، بارہ بجے کیا ہے۔ وقت کی یہ تقسیم کس نے کی ہے؟'' کہنے لگے ''انسانوں نے۔''میں نے کہا..... ''بالکل ٹھیک، وقت کو ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں تو حضرتِ انسان نے اپنی آسانی کے لیے تقسیم کر رکھا ہے ورنہ یہ زماں بجائے خود ایک دریا کی مانند رواں دواں ہے..... بھلا اللہ انسانوں کے پروگرام پر کیوں چلے گا! وہ تو زمان و مکان سے ماورا ہے۔

لیس عند اللہ صباح و الامساء

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک صبح و شام نہیں۔''

اس نے ہمارے لیے رات اور دن اس لیے بنائے کہ ہم سہولت سے رہیں اور اوقاتِ کار کی تقسیم کر لیں۔ جن علاقوں میں مہینوں کے دن رات ہوتے ہیں دنیاوی اعتبار سے تو وہاں کے باشندوں کی عمریں بمشکل چند سال ہوں گی۔ تو کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ حضرت نوحؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت ادریسؑ کی عمریں اس لیے دراز تھیں کہ ان کے زمانے میں دن رات چھوٹے تھے۔''

بچوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ بے شک وقت کا جبر انسان کا اپنا

مسلّط کردہ ہے۔ فقیر نے سورۃ دہر کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ زمانے سے کیا مراد ہے اور وقت کیا ہے۔ یہ بھی عرض کیا کہ ذاتِ قدیم پر وقت اثر انداز نہیں ہوتا۔ اگر آپ زمین کے مدار سے باہر نکلیں تو پھر حقیقت کی خبر ملے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ سب میری اولاد ہیں، علم حاصل کریں، ملک وقوم کی خدمت کریں، احکامِ دین پر عمل پیرا ہوں مگر ذاتِ حقیقی کو سمجھنے کے لیے وہی Methodology اختیار کریں جو منزل پر پہنچائے یعنی "عشقِ حقیقی۔"

غرض بچے مطمئن گئے اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ تلاوتِ قرآنِ کریم، پابندیٔ ارکانِ اسلام، ذکرِ الٰہی اور درود شریف کو اپنائیں گے اور اپنے سینوں میں علم کے ساتھ ساتھ عشق کی شمع بھی فروزاں رکھیں گے۔ میری قوم کا سرمایہ وہ نوجوان جہاں رہیں خوش رہیں اور اللہ انھیں اپنے وعدے پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سالک کے لیے ضروری ہے کہ اصطلاحوں کے بنیادی نکات کو سمجھے اور اپنی منزل کے مطابق عمل کرے۔ بلقیس کا تخت لانے والے (آصف بن برخیا) کے لیے وقت کا مفہوم بالکل جدا ہے۔ اسی طرح تصوف میں حجابات کا اٹھنا وقت کو قطع کرنے کے مترادف ہے۔ بہت کم لوگ "الوقت السیف" کی معنویت کو سمجھتے ہیں۔ وقت قاطع ہے، اس قول کا مطلب یہ ہے کہ لوگ حسبِ توفیق اس کے مدار سے نکلتے اور اس میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی سالک اپنے شیخ کے پاس اس نیت سے بیٹھے کہ ایک آدھ گھنٹے میں فیض پالے گا تو گویا وہ Stopwatch کے اصول پر عمل پیرا ہے۔ اگر شیخ آپ کو پلک جھپکنے میں حرم شریف اور دربارِ رسالت ﷺ کے مناظر دکھا کر واپس لے آئے اور گھڑی ابھی چار ہی بجا رہی ہو جبکہ آپ 3:55 پر آئے ہوں تو اسے کیا کہیں گے۔

ایک کامل شیخ کی نگاہ پاتال سے برزخ اور اس سے بھی اوپر لا اور لے جا سکتی ہے۔ یہ ہے شیخ پر ایمان کا ادنیٰ درجہ اور تصوف کی ابتدا۔ اس لیے قارئین نے کبھی بھی صوفیاء اور اہل اللہ کو انسانی گھڑی کے مطابق وقت پر گفتگو کرتے نہ سنا ہوگا۔ میں نے اپنے شیخِ مکرّم کو کبھی نہیں دیکھا کہ وہ روحانی منازل یا معرفت کے نکات بیان کرتے وقت فرما رہے ہوں کہ جب میں دربارِ اقدسؐ میں باریاب ہوا تو پانچ بجے تھے۔ زیادہ سے زیادہ پہروں کا بیان ہے اور وہ بھی صلوٰۃ و اقامت کے ضمن میں۔ سالک کا رُتبہ یہ ہے کہ مُرشد کی نگاہِ بُلند اسے ان مقامات پر پہنچا دیتی ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں۔ یہ پاکیزگیٔ قلب کا کرشمہ ہے جو صرف اور صرف اللہ کے کرم اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے نصیب ہوتی ہے۔ مرشد کی نظر ہو تو سالک کا سفر صدیوں کی بجائے گھڑیوں میں طے ہو جاتا ہے لیکن یاد رہے کہ مرتبۂ عشق، اطاعت اور عاجزی کی عطا ہے۔ یہاں اطاعت سے مراد محض ہاتھ چومنا یا پاؤں دابنا نہیں بلکہ طلبِ علم کی بھرپور کوشش ہے۔ جب سالک اپنا آپ شیخ کو سونپ دیتا ہے تو اس پر اختیار کے در وا ہو جاتے ہیں۔ فقیر نے یہ وضاحت اس لیے ضروری خیال کی کہ صاحبانِ ذوق مہمیز پا کر آگے بڑھیں اور وقت کی غلط بحثوں میں نہ پڑیں۔ واقعۂ معراج پر گواہی دینے والے کا شرف ہی یہ ہے کہ اسے خواہ مخواہ کے الجھاوے درپیش نہیں ہوتے۔

ایک مقام پر حضرت بایزید بسطامیؒ کو انوارات توحید میں گھرا دیکھا تو مجھے 'تذکرۃ الاولیاء' میں شامل حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول یاد آ گیا:

"بایزید بسطامیؒ ہم لوگوں میں ایسے ہیں جیسے ملائکہ میں جبرئیلؑ۔"

بے شک آپؒ کے اوصاف اولیائے کرام کا زیور ہیں لیکن عشقِ توحید وہ نعمت ہے جو حضرت موصوف کے خاص مراتب میں سے ایک ہے۔ مجھے دیکھتے ہی دعاؤں

سے نوازتے ہوئے سلام کیا۔ میں نے تعظیم کے ساتھ جواب دیا تو فرمایا..... ''تابش بیٹے، میں کافی دیر سے آپ کا منتظر تھا۔ آئیں اپنی امانت لے لیں تاکہ میں سُرخرو ہو سکوں۔'' یہ کہہ کر آپؒ نے عقیق کی ایک تسبیح میرے سپرد کی۔ میں نے ممنونیت کا اظہار کیا تو فرمایا..... ''یہ تسبیح حضرت الیاسؑ سے ہوتی ہوئی مجھ تک آئی ہے، حکمِ رسالت مآب ﷺ کی تعمیل میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں۔''

میں نے رقت کے ساتھ اللہ اکبر اور الحمدللہ کا ورد کیا جس میں حضرت بایزیدؒ بھی شریک ہو گئے۔ عرض گزار ہوا.... ''حضرت آپؒ ان ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے دین کی پیروی کا عملی نمونہ فراہم کیا۔ بے شک سورہ لقمان آپؒ کی زندگی میں انقلاب کا باعث بنی، میرے لیے کوئی نصیحت؟'' یہ سن کر میرے حق میں دعا کرتے ہوئے فرمایا..... ''آپ کو سونپی گئی ذمہ داری کے حوالے سے کافی کام تو سرانجام پا چکا ہے لیکن حضراتِ برزخ میں سے چند مزید حضرات کو بھی کچھ ذمہ داریاں تفویض کر دی گئی ہیں تاکہ کام تیزی سے ہو سکے۔'' میں نے شکریہ ادا کیا اور آگے روانہ ہوا۔

برزخ عجیب و غریب مقامات کا حامل ہے۔ بعض اللہ والے ایسے ہیں جن کے نام سے عام لوگ نسبتاً کم شناسا ہیں لیکن وہ ایسے درجات پر فائز ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت فضیل بن عیاضؒ۔ راقم نے دیکھا کہ عبادت میں اس طرح محو تھے کہ خشوع و خضوع کے باعث ان کا پورا بدن بانس کی طرح کانپتا تھا۔ فراغت کے بعد میری جانب متوجہ ہوئے تو عرض کی...... ''یقیناً آپؒ کو اللہ کے خزانوں میں سے بہت کچھ عطا ہوا، کیا یہ لٹیروں کے قافلے سے الگ ہونے کا ثمر ہے؟''

یہ سن کر مسکرائے اور مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے..... ''ہم جیسے بس اتنا ہی بلند ہو سکتے ہیں کہ اللہ کے کرم سے ڈاکا چھوڑ کر صراطِ مستقیم پر آجائیں۔ یہ تو ابنِ کمال کا

نصیب ہے کہ باری تعالیٰ نہ صرف اسے پسند فرماتا ہے بلکہ اس کے بدن پر اپنے نام کی مہر بھی ظاہر کرتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے حضرتؒ نے اس عاجز کا دایاں ہاتھ فرطِ جذبات سے چوم لیا، پھر نمناک آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے..... "میری زندگی تو سورہ الحدید کی آیت الم یان للذین امنوا ن تخشع قلوبھم لذکر اللہ (کیا مومنوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے نرم ہو جائیں) نے بدل کر رکھ دی۔" عرض کیا..... "حضرت کیا یہ درجہ کم ہے کہ اللہ نے آپؒ کو اپنے مقبول بندوں میں شمار کیا اور مخصوص مقامات عطا فرمائے۔" میری بات سن کر حضرت فضیلؒ طویل سجدے میں چلے گئے۔ میں یہ کیفیت ملاحظہ کر کے سبحان اللہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔

اس کے بعد جس ہستی سے ملاقات ہوئی وہ علمی اعتبار سے بلاشبہ اہلِ تصوف کے محسن ہیں۔ حضرت حارثؒ حالتِ مراقبہ میں سانس روکے تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام کیا تو آنکھیں کھولیں اور اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ مجھے کچھ یاد آیا اور عرض کیا...... "جنابؒ تو اپنے والد کے ترکے سے دستبردار ہو گئے تھے۔" میری بات سن کر مسکراتے ہوئے فرمایا..... "نبی کریم ﷺ کے ارشادِ پاک کی روشنی میں کہ دو مختلف مذاہب کے افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، اپنے مجوسی المذہب والد کے ترکے سے کچھ نہیں لیا۔" میں نے کہا..... "صرف ترکے سے دستبرداری اتنا مقام نہیں دلا سکتی، کیا آپؒ جانتے ہیں کہ یہ مرتبۂ بلند کیسے نصیب ہوا؟" فرمایا...... "یہ تو معلوم نہیں لیکن ایک بات کا بخوبی علم ہے کہ تنہائی میں اللہ کا ذکر زیادہ نفع دیتا ہے اور نفس کا محاسبہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے"۔ میں نے کہا..... "اسی لیے تو آپؒ آج بھی محاسبی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔"

پھر آپؒ نے اپنی کتاب 'الرعایہ' سے کچھ خاص باتیں تعلیم فرمائیں اور میرے

ماتھے پہ بوسہ دے کر دعا کے لیے کہا۔ راہی بارگاہِ تعالیٰ میں عرض گزار ہوا ''اے اللہ! انھیں اپنے مخصوص بندوں میں شامل فرما۔'' حضرت محاسبیؒ نے مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے دعاؤں سے نوازا اور راقم اگلی منزل کے لیے روانہ ہوا۔

یہاں یہ بتا تا چلوں کہ امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت حارثؒ کے درس پر پابندی عائد کرادی تھی اور وہ کچھ عرصہ جلاوطن بھی رہے تھے۔ فقہا نے حضرت محاسبیؒ پر بہت اعتراضات کیے لیکن آپؒ گوشہ نشیں ہو کر طہارتِ نفس میں مصروف رہے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ امام غزالیؒ پر بھی آپؒ کے بے پناہ اثرات ہیں۔ فقیر کا خیال ہے کہ صوفیاء پر فقہا کے اعتراضات ان کی ظاہر پرستی کے سبب ہیں ورنہ اگر انھیں اہل اللہ کی قلبی و روحانی معرفت کا اندازہ ہو جائے تو اپنی آراء سے یقیناً رجوع کریں۔ فقیر نے حضرت حارثؒ کو قرآن و حدیث اور تصوف پر ایسی گفتگو کرتے سنا جو اہلِ ایمان کے لیے روح پرور ہے۔ آپؒ نے فروعی اور غیر ضروری بحثوں کی مذمت کی اور بتایا کہ کیسے قرآن کریم نے اہل اللہ کی پوری کیفیت کو کئی مقامات پر صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یقیناً ہمارے لیے قرآن و حدیث ہی دلائل کا سب سے بڑا خزانہ ہے جس کا حرف حرف ہر قسم کے شک و شبہے سے بالاتر ہے۔ اگر اس سے رشتہ استوار کیا جائے تو کوئی مشکل در پیش نہیں ہوتی۔ سورہ ق (۳۷) میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

ان فی ذلك لذكرى لمن كان له قلب اوالقى السمع وهو شهيد

''بے شک قرآن میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو دل رکھتا ہو اور پوری توجہ سے کان لگا کر اللہ کے احکامات سنتا ہو۔''

اسی طرح سورۃ الزمر (۱۸) میں ارشادِ پاک ہے:

الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولئك الذین

هدهم الله واولئك هم اولوا الالباب

"(اے محمد ﷺ، میرے ان بندوں کو خوشخبری دیجیے) جو (قرآن کی)

باتوں کو غور سے سُنتے ہیں پھر اس پر اچھی طرح عمل کرتے ہیں یہی وہ لوگ

ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی اور یہی ہیں جو عقل اور فہم رکھتے ہیں۔"

تصوف کے نام پر لکھی گئی اکثر کتب میں اولیاء کے فقہی نظریات کے حوالے سے بحث چھیڑی جاتی ہے۔ تصوف فقہوں کا احترام سکھاتا اور رواداری کا درس دیتا ہے۔ یہ سراسر عشق ہے۔ اس کے اسرار سے واقفیت کی لذّت جادۂ عشق کے کسی مسافر ہی کا مقدر ہو سکتی ہے۔ ایک عارف کا حال کوئی عارف ہی جان سکتا ہے۔ ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ شبلیؒ اور منصور کے ایک دوسرے کے بارے میں کیا خیالات تھے یا حضرت جنیدؒ منصور کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ عین ممکن ہے کچھ لوگ راقم کی طرح از خود رفتگی کو عشق کی مسافت میں کوتاہی اور زیاں کا سبب جانتے ہوں لیکن ہمیں اپنے نظریات دوسروں پر تھوپنے سے گریز کرنا چاہیے۔

فقیر شیخ القرآن، شیخ الحدیث اور سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ سے بھی ملا۔ ان کی صحبت تازگیٔ روح عطا کرتی ہے۔ فقیر نے انھیں حضرت محاسبیؒ کی طرح مہکتا ہوا پایا۔ سلام کے بعد عرض کیا..... "حضرت آپؒ نے اپنے دور میں تصوف کو اہلِ ظاہر کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جو خدمات سرانجام دیں وہ اہلِ علم اور اہلِ عشق سے کسی طور پوشیدہ نہیں۔ کتنی خوش بختی ہے کہ آپؒ کے ماموں اور مرشد حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا..... "کبھی مرید مرشد سے بھی بلند ہو جاتا ہے اور میرا جنید اس

نکتے کی عملی تفسیر ہے۔" آپؒ نے گلے لگاتے ہوئے فرمایا......"وہ بیٹا بھی تو خوش نصیب ہے جس کا باپ اس کا شیخ ہو اور فرمائے کہ میں تابش صاحب کا باپ اور شیخ ہونے پر فخر کرتا ہوں۔" میں نے کہا......"میرے لیے باعثِ اعزاز ہے کہ میں سیّدالطائفہ سے مل رہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے حضرت حارث المحاسبیؒ سے ملاقات نصیب ہوئی۔ کیا معتزلہ کی تردید کے لیے علومِ عقلیہ اور علم الکلام لازمی ہے؟"

جناب جنیدؒ نے جواب دیا......"بیٹے، یہ عمل کچھ ایسا غلط بھی نہیں لیکن ضروری ہے کہ سب سے پہلے فتنہ کی تردید کے لیے قرآن و حدیث کو ایمان اور معیار بنایا جائے۔ ایک سچا عارف انہی مآخذات سے منکرین کو دلیل دے سکتا ہے۔ میں نے پہلے قرآن اور حدیث کی معرفت حاصل کی پھر حضرت حارثؒ کی صحبت میں پہنچا، بے شک وہ ولی کامل ہیں اکثر لوگوں کو ان کی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔" میں نے حضرت جنیدؒ سے دیگر علوم کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا....."جدید علوم نہ صرف مومن کا حق ہیں بلکہ ان تک رسائی لازمی ہے بس ایمان کی سلامتی ملحوظ رہے۔"

پھر فرمایا......"میں بہت خوش ہوں کہ آپ اپنے روحانی سفر کے ساتھ ساتھ بارگاہِ نبوی ﷺ سے سونپے گئے فرائض بھی بہ احسن سرانجام دے رہے ہیں۔" میں نے عرض کی......"یہ سب اللہ کے کرم اور آپ بزرگوں کی شفقت و مہربانی کا ثمر ہے، ورنہ میرے جیسا شخص شاید یہ بار نہ اٹھا سکتا۔" حضرت جنیدؒ نے فرمایا......"بادۂ توحید کی مستی سب سے بڑھ کر ہے، سارے علوم اسی میں ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اللہ نے عہدِ حاضر کو آپ کی برکتوں سے مالا مال کرنا ہے، میں بحکم دربارِ رسالت ﷺ امتِ محمدیہ کی بھلائی کے لیے ہمیشہ آپ کا معاون رہوں گا۔" میں کلماتِ تشکر ادا کر کے آگے بڑھنے لگا تو سنا کہ حضرت جنیدؒ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے:

واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهور هم ذریتهم و

اشهد هم علی انفسهم الست بربکم قالو بلی

شهدنا (الاعراف۔۱۷۲)

''اور جب آپ ﷺ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی ذریت

کو نکالا اور ان سے اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو سب نے

اقرار کیا کہ ہاں لاریب، ہم گواہی دیتے ہیں۔''

بلاشبہ تمام ارواح اقرار سے بندھی ہوئی ہیں۔ یومِ الست کو انسانی ارواح ہی نے یہ اقرار کیا تھا کہ بے شک تو ہی ہمارا رب ہے تو ان سے وعدہ لیا گیا کہ وہ جسمِ انسانی میں آنے کے بعد بھی اپنی اصل پر قائم رہیں گی اور آلائشوں کو قریب نہیں آنے دیں گی۔ اب جس کسی نے حد سے تجاوز کیا اور اپنا عہد توڑا وہ منکرین میں سے ہے۔ مومن کا فرض ہے کہ وہ عہد نبھائے اور نفس کو مات دے کر روح کو اسی مقدس اور پاک صورت میں اپنے رب کے پاس لے جائے جس شکل اور حالت میں وہ اسے امانتاً دی گئی تھی۔ مذکورہ آیت یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ اولادِ آدم کا اپنے خالق کے ساتھ سب سے پہلا کلام وعدے اور اقرار کی صورت میں تھا۔ جب ربّ کریم جگہ جگہ اپنے قول کی قسم کھاتا ہے تو بندے پر لازم آتا ہے کہ وہ بھی اس قول وقرار کا پاس رکھے جو اس نے ساعتِ اوّلین میں اپنے رب کے ساتھ کیا تھا۔

حقیقی معرفت دراصل قولِ اوّل کے ساتھ منسلک ہے اور توحید کا آئینہ ہی حضوری کا ضامن ہوسکتا ہے۔ قارئین کے لیے فقیر کی ہدایت ہے کہ کمزور لمحوں میں مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کا شرف حاصل کریں تا کہ وعدے کی بازگشت اور اقرار کا ذائقہ کانوں اور زبان کو پھر سے پاک کردے۔ راقم اس تصوف کو تصوف نہیں سمجھتا جو سالک

کو جبہ و دستار تو پہنا دے لیکن اسے فہمِ دین سے دور رکھے۔ بد قسمتی سے ایسے حضرات عام ہیں لیکن اس زمانے میں بھی اہل اللہ کی موجودگی دل کو تقویت دیتی ہے۔

وعدے کی پاسداری اولیاء کا خاصہ ہے۔ حضرت غوث الاعظمؒ، حضرت محاسبیؒ اور حضرت جنیدؒ نے شام و عراق، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے حوالے سے کیے گئے تمام عہد نبھائے اور برزخ سے اپنے نمائندوں کو احکامات دیتے رہے۔ مذکورہ علاقوں میں ان عالی مقام بزرگوں کی سرپرستی کے بغیر مطلوبہ نتائج کے حصول میں تاخیر ہو سکتی تھی۔ جس طرح وہاں کے صوفیاء اور علماء نے عوام الناس کی ماہیتِ قلب میں اپنا کردار ادا کیا یقیناً یہ انہی نفوسِ قدسیہ کا خاصہ تھا۔ الحمدللہ اب یہ بات یقینی ہے کہ عراق و شام کے حوالے سے طاغوتی قوتوں کی ہر کوشش ان کے لیے رُسوائی اور جگ ہنسائی کا باعث بن جائے گی۔

اگلے قدم پر مسافر نے حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کو کلماتِ شکر گزاری ادا کرنے میں مصروف دیکھا تو بے تابی سے ان کی طرف قدم بڑھائے۔ میرے قریب آنے پر خواجۂ خواجگان نے اٹھ کر معانقہ فرمایا۔ عرض کیا ''مبارک ہیں وہ آنکھیں جنھوں نے سیدنا غوث الاعظمؒ کی زیارت کی اور زرّیں دور پایا۔'' حضرتؒ مسکرائے اور فرمایا..... ''اویسی خوش بخت ہیں جنہیں حضرت اویس قرنیؓ سے آپ تک باعمل اور خوبصورت سربراہ میسّر آئے۔'' پھر فرمایا..... ''آپ نے اہلِ سلوک کے پانچوں امور بہ حسن و خوبی سرانجام دیے۔''

میرے استفسار پر وضاحت کی..... ''ماں باپ کا چہرہ دیکھنا اور پوری کوشش سے ان کی خدمت بجا لانا، قرآنِ کریم کو دیکھنا اور اس کو سمجھ کر عمل کرنا، علماء کی زیارت کرنا اور ان سے فیض پانا، خانۂ کعبہ کو دیکھنا اور اس کی تعظیم کرنا، اپنے مرشد کو دیکھنا، ان

سے فیض پانا اور خدمت کرنا۔ آپ نے حضرت باغ حسین کمالؒ کی فرزندگی کا حق ادا کیا اور والدہ محترمہ کی خدمت گزاری میں فریضۂ حج ادا کیا۔ قرآن مجید کو سمجھ کے پڑھا اور عمل پیرا ہیں، مولانا اللہ یار خانؒ کی محفل میں شریک رہے، خانۂ کعبہ کی زیارت کے وقت وارفتگی کے عالم میں ربِّ کریم کی حمد شاعری میں بیان کی اور بطور سالک اپنے شیخِ مکرّم کی وہ خدمت کی کہ تمام اہلِ برزخ خصوصاً حضرت بایزید بسطامیؒ فخر کا اظہار فرماتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے تمام امور ایک دوسرے سے گہری مطابقت رکھتے ہیں۔" فقیر نے الحمد للہ کہا اور اجازت لے کر آگے بڑھنے لگا تو مژدہ سنایا"..... شیطنت پر اترے ہوئے حکمرانوں کو پاکستان کے خلاف مذموم عزائم پر عمل پیرا ہونے سے باز رکھنے اور ہندوستانی مسلمانوں میں جذبۂ ایمانی بڑھانے کے لیے ہند کے اولیاء کو طریقۂ کار سمجھا دیا گیا ہے۔" میں نے ایک بار پھر شکریہ کہا اور سلام عرض کر کے آگے روانہ ہوا۔

فقیر کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگلی منزل پر سلطان الصوفیاء حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے ملاقات نصیب ہوئی۔ آپؒ کے صاحبزادے حضرت شیخ عبد الرزاقؒ کی قیادت میں بہت سے نامور اولیائے کرام نے راقم کا استقبال کیا اور مجھے آپؒ کی خدمت میں لے گئے۔ غوثِ اعظمؒ نے پیشوائی فرمائی، اپنے پہلو میں بٹھایا اور میرے دونوں رخساروں پر بوسہ دے کر فرمایا.....

"ہمارا اویسی بیٹا نسبت کا لحاظ خوب رکھتا ہے اور ان مقامات کو بہت دھیمے لہجے میں بیان کرتا ہے جو اسے عطا ہوئے۔ کیوں نہ ہو کہ اسے سارے شرف اور نسبتیں حاصل ہیں۔ میں ربِّ کریم کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے بیٹے کو ان مراتب کے لیے چنا جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتے۔ تمام سلاسل کے سربراہ آپ کو اپنی نسبتیں

عطا کرتے ہیں۔" میں نے فرطِ جذبات میں عرض کی..... "یا شیخ میری سب سے بڑی نسبت رسول کریم ﷺ، میرے حضرت جیؒ اور حضرت حاجی احمد ہیلانیؒ کے توسّل سے آپؒ ہیں لیکن آپؒ کے حکم کی تعمیل میں ان حضراتؒ کی نسبتیں شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔"

میں نے 'غنیۃ الطالبین' کی بابت دریافت کیا تو نیم لب مسکرائے اور فرمایا "غنیۃ الطالبین بے شک میری ہی تصنیف ہے۔" پھر تاکید فرمائی "جب دربارِ اقدس میں باریابی ہو تو تمام نیک ارواح کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔" پھر آپؒ نے شانوں سے پکڑ کر سینے سے جو لگایا تو اللہ کے فضل سے تمام منازل یوں طے ہوئیں کہ روشنی سے موازنہ بھی نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں احتراماً جھکا تو دعا دیتے ہوئے قصیدۂ غوثیہ کی خصوصی اجازت بھی عطا فرمائی۔

راقم علماء اور فقہاء سے بھی ملا جنھوں نے نہ صرف ہمت افزائی کی بلکہ میرا اشوق ملاحظہ فرما کر بہت سے کارآمد نکات بھی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے۔ برِصغیر کے مشہور فقیہہ حضرت مولانا ولی اللہ فرنگیؒ سے ملاقات پر میں نے آپؒ کی تفسیرِ قرآن 'معدن الجواہر' کی تعریف کی تو مسرور ہوتے ہوئے فرمایا..... "بیٹے، یہ سب کچھ توفیقِ ایزدی سے ممکن ہوتا ہے۔" پھر مجھے 'مرأۃ المومنین' کا کچھ حصہ سنایا جو ایمان والوں کے لیے انمول تحفہ ہے۔ حضرت سیّد وحید الحق پھلوارویؒ سے ملاقات کے دوران مسافر کوان کی لکھی ہوئی کلمہ طیبہ کی بے مثل شرح انھی کی زبانی سننے کی سعادت بھی میسر آئی۔ آپؒ نے میرے سامنے بڑے لطیف اور باریک نکتے کھولتے ہوئے فرمایا "شرح کلمہ طیبہ کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں بھی فضیلت حاصل ہے۔"

اگلی ملاقات برہان پور کے صاحبِ کشف فقیہہ حضرت سیّد نصیر الدین حسینیؒ سے ہوئی اور بہت سے اسرار کھلے۔ بے شک 'شعب الایمان' اور 'تنبیہہ الاغنیاء فی فضائل سیّد الاصفیاء' آپ کی لاجواب تصانیف ہیں اور نافہموں پر کڑی گرفت کرتی ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ راقم جن فقہا سے ملا ان میں حضرت سیّد محمد لطیف مچھلی شہریؒ، حضرت مولانا محی الدین عثمانی بدایونیؒ، حضرت محمد برکت عظیم آبادیؒ، حضرت مولانا محمد علی بھیرویؒ، حضرت غلام محمد لاہوریؒ، مولانا کریم اللہ فاروقیؒ اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے اسمائے گرامی دمِ تحریر ذہن میں فروزاں ہیں۔ ان تمام حضرات نے فقیر کی ہر طرح سے رہنمائی فرمائی اور علوم کی نسبتیں عطا کیں۔ اللہ ان پر دائم اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

فقیر آگے بڑھا تو ایک نورانی صورت بزرگ قریب آئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں کچھ پوچھے بغیر اُن کے ساتھ چل دیا۔ وہ ایک مقام پر آ کر رُکے، مجھے وہیں کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور کہیں چلے گئے۔ کچھ ہی دیر میں اپنے جیسے بہت سے پرنور بزرگوں کے ہمراہ واپس تشریف لائے اور فقیر کی تکریم کرتے ہوئے دائرے میں لے کر آگے بڑھے تو ایک مقام پر اپنے شیخ اور والدِ گرامی حضرت جی باغ حسین کمالؒ کو تشریف فرما دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اُن کے گرد بے شمار افراد تھے جو آپؒ کی آواز میں آواز ملا کر درود شریف پڑھ رہے تھے۔ میں بھی شریکِ ورد ہو گیا۔ کچھ دیر بعد آوازیں تھم گئیں تو حضرت جیؒ میری جانب بڑھے۔ میں نے اُن کے پاؤں چومے اور مبارک ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر کہا..... "سبحان اللہ، یہاں بھی درود شریف جاری ہے۔" مجھے سینے سے لگاتے ہوئے فرمایا..... "بیٹے الحمد للہ آپ بھی اپنی روحانی مُسافت کے دوران بسم اللہ شریف اور درودِ پاک سے اپنی زبان مشک بو کیے

ہوئے ہیں۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ آپ سلسلۂ عالیہ کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں اور دوسرے وظائف کی زیادتی کے باوجود میری ہدایت کے مطابق حسبِ معمول دربارِ اقدس ﷺ میں روزانہ درود شریف کے پھول پیش کرتے ہیں۔" میں نے عرض کی "شیخِ محترم کی عطا اور حکم کو پسِ پشت ڈال کر فقیر اور اس کے ساتھی ناشکری کے مرتکب کیسے ہو سکتے ہیں۔ تحدیثِ نعمت پہ اصرار اور کفرانِ نعمت سے انکار ہی تو تصوف ہے۔ انشاءاللہ آپ کو کبھی کمی محسوس نہیں ہوگی۔"

یہ سن کر حضرت جیؒ کا چہرۂ انور فرطِ مسرت سے اور بھی تابندہ ہو گیا۔ فرمایا.....

"بیٹے الحمد للہ آپ نے بہت محنت اور معاملہ فہمی سے کام لیا ہے۔ آپ کو تفویض کردہ امور کے حوالے سے اکابر اولیائے کرام کو ہدایات جاری کی جا چکی ہیں انشاء اللہ کامیابی کی منزل دور نہیں۔" میں ادب سے سرخمیدہ کھڑا رہا کہ نگاہ قدموں سے اٹھتی ہی نہیں تھی۔ فرمانے لگے "...... بیٹے اللہ کا شکر ہے کہ برزخ کے دوست اور تمام آسمانوں کی نوری مخلوق درود شریف کے ورد میں ہماری تعداد پر حیران ہے۔ بے شک اللہ نے اپنے بندے پر یہاں بھی کرم کے در کھلے رکھے ہیں۔"

میں نے عرض کی "یہ تائیدِ باری تعالیٰ اور عشقِ رسالت مآب ﷺ ہے کہ فقیر آپ کے سپرد ہوا اور اس نسبت کے صدقے فضیلتِ درود شریف کی سمجھ نصیب ہوئی۔" پھر حضرت جیؒ نے فرمایا "تابش صاحب، ایک اور وظیفہ بطور تحفۂ خاص مقرر کیا جاتا ہے۔ ہدایت ہے کہ سورۃ کوثر بعد از نمازِ عشاء سو بار تلاوت کیا کریں۔ لیکن یہ صرف آپ کے لیے ہے۔" (پھر پڑھنے کا طریقۂ کار سمجھایا) اس کے بعد مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا...... "اللہ نے یہ سورہ بولہبیوں کو تا حشر اور اس کے بعد بھی ذلیل و خوار رکھنے کے لیے اتارا۔ مجھے خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے حکم دیا ہے کہ"

اُن کی نسبت ان کی طرف سے عطا کی جائے۔'' (اپنی مُسافت کے بعد درویش دربارِ خاص میں پہنچا تو پاک بی بی نے اپنا بیٹا قرار دیتے ہوئے خود بھی مذکورہ سورۃ کی اجازت مرحمت فرمائی)۔اسی دوران حضرت جی کو دربارِ اقدسؐ میں طلب فرمایا گیا تو آپؒ نے اپنے عاجز مرید اور بیٹے کو بہت سے دیگر انعامات وتحائف سے مالا مال فرما کر دُعاؤں کے ساتھ اگلی منزل کی جانب روانہ کیا۔

راقم دربار اقدس ﷺ میں حاضری کے بعد حضرت علی المرتضیٰؓ اور حسنین کریمینؓ کی زیارت کو اپنی زندگی کے سعد ترین لمحات میں شمار کرتا ہے۔ان ہستیوں نے مجھ پر لطف وکرم کے خزانے کھول دیے اور یہ انہی کا فیضان تھا کہ برزخ میں میری طویل ترین ملاقات مرتب القرآن اور قاری القراء حضرت زید بن ثابت انصاریؓ سے ہوئی جنھوں نے بہت شفقت اور توجہ کے ساتھ مجھے اپنے روبرو بٹھایا اور فرمایا...... ''میں منتظر تھا، آپ کے حوالے سے مجھے کچھ ذمہ داری سونپی گئی ہے۔''

میں نے سر جھکا کر عرض کیا'' جناب سے اللہ اور شیخینؓ نے وہ کام لیا جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوا، آپؓ ہی نے کلامِ الٰہی کو اکٹھا فرمایا اور ایسے گواہ پیش کیے جنھیں بحمد للہ قیامت تک کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ آپؓ کی احتیاط پسندی نے آج تک اُمّت کو گمراہ نہیں ہونے دیا اور تمام مسلمان ایک قرآن پر متفق اور جمع ہیں۔'' میری بات پر ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، فرمایا..... ''بیٹا یہ بہت مشکل، صبر آزما اور دقت طلب کام تھا۔ اللہ کی نصرت شاملِ حال نہ ہوتی، نبیٔ کریم ﷺ سے آخری دورۂ قرآن نہ کیا ہوتا اور پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہمت نہ بندھاتے تو اس خدمت کی انجام دہی ناممکن تھی لیکن اللہ قوی ہے جس سے چاہتا ہے کام لے لیتا ہے۔ پھر وہ زمانہ بھی عجیب تھا کہ کفار قرآنِ مجید کے ارشادات کو فرموداتِ رسول ﷺ سمجھتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

وما ينطق عن الهوى ٥ ان هو الا وحي يوحى ٥

''وہ (یعنی رسول کریم ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے بلکہ وہ وحی ہی ہوتی ہے۔'' (النجم۔۳،۴)

میں نے کہا ''بے شک، اس میں کیا کلام ہے کہ رسول اللہ ﷺ رضائے ربّانی کے سوا کسی جانب ملتفت نہ ہوتے اور وہی فرماتے جو جبریل امین حضور تک پہنچاتے۔ یا حضرت! آپ کاتبِ وحی بھی ہیں۔ براہِ کرم ارشاد فرمائیے کہ اس دور میں قرآنِ کریم کی کتابت اور ظاہری تحفّظ کے کیا وسائل تھے۔''

اس پر حضرت زید بن ثابت نے فرمایا ''ہم عسب (کھجور کی چھال)، قتب (اونٹوں کے پالان کی لکڑی)، قضیم (سفید چمڑا)، لخاف (سفید نفیس پتّھر) اور حریر (ریشمی کپڑا وغیرہ) استعمال کرتے تھے تاہم آخری دنوں میں رَق (پتلا چمڑا) اور قراطیس (کاغذ) نسبتاً زیادہ مصرف میں لاتے تھے۔ ہم کاغذوں کو کھال میں لپیٹ کر غلاف کرلیا کرتے تھے تاکہ عبارت اور کاغذ محفوظ رہے۔''

میں نے عرض کیا..... ''بے شک قرآنِ مجید فرقانِ حمید نے واضح طور پر اپنے کلامِ رب ہونے کی دلیل دی ہے۔

ام يقولون افتره قل فاتوا بسورة مثله وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صدقين (یونس۔۳۸)

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو (محمدؐ نے) ازخود بنایا ہے؟ کہہ دیجیے اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنالاؤ اور اللہ کے سوا جسے بھی بلا سکتے ہو بلا لاؤ۔''

لیکن کوئی ایک بھی سورہ بطور مثال نہ لا سکا۔ یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ ربّ کائنات نے قرآنِ مجید کی حفاظت کا وعدہ بھی تو فرمایا ہے۔ حضرت زید بن حارثؓ میری بات پر خوش ہوئے اور فرمایا..... ''وقت کم ہے اور ابھی آپ کو کافی مُسافت طے کرنی ہے۔ مجھے قرآنِ کریم کے کچھ موضوعات پر روشنی ڈالنے کی ذمّہ داری سونپی گئی ہے۔'' میں اس کرم نوازی پر شکر گزار ہوا تو ارشاد فرمایا ''پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ قرآنِ کریم ہر دور کے علم و عمل کا خزانہ ہے۔ اس میں کائنات کے ارتقاء سے لے کر روزِ حشر تک تمام باتوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ سورۃ النزعت (۲۷۔۳۱) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ء انتم اشد خلقا ام السماء بنها ہ رفع سمکها فسوهاہ
واغطش لیلها واخرج ضحها ہ والارض بعد ذلك
دحهاهاہ اخرج منها ماء ها ومرعها ہ

''کیا تمہارا خلق کرنا دشوار ہے یا اس آسمان کو جسے اس نے بنایا؟ اللہ نے اس کا سقف اونچا کیا، پھر اسے معتدل بنایا اور اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو روشن کیا پھر اس نے زمین کو بچھایا، اس سے پانی اور چارہ نکالا۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین و
تجعلون له اندادا ذلك رب العلمین ہ وجعل فیها
رواسی من فوقها وبرك فیها و قدر فیهآ اقواتها فی اربعة
ایام سوآء للسآئلین ہ (حم السجدہ۔۹،۱۰)

''کہہ دیجیے، کیا تم اس ذات کے منکر ہو اور اس کے لیے مدِ مقابل قرار

دیتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا! وہی تو عالمین کا رب ہے
اور اسی نے زمین کے اوپر پہاڑ بنائے، اس میں برکات رکھ دیں اور
اس میں چار دنوں میں ضرورت مندوں کی ضرورت کے برابر سامانِ
خوراک مقرر کیا۔''

بیٹے! قرآنِ مجید نے کائنات کی پیدائش اور مالک الملک کی نشاندہی فرما دی اور بتا دیا کہ اللہ ہی مسبب الاسباب ہے۔ دیکھیں **والارض بعد ذلک دحھا** (النزعت۔ ۳۰) کا ترجمہ لوگ یہ بھی کرتے ہیں ''اس کے بعد اس نے زمین کو بچھا دیا'' لیکن اس کا زیادہ مفید ترجمہ یہ ہے ''اس کے بعد اس نے زمین کو حرکت دے دی۔'' میں نے عرض کیا...... ''سبحان اللہ! یہ ترجمہ تو جدید سائنسی نظریات کے بھی عین مطابق ہے۔'' اس پر آپؒ نے فرمایا ''**الدحی** کا مطلب پھینکنا اور حرکت دینا بھی ہے۔ اللہ نے زمین کو اس کے مدار میں یوں رکھ دیا کہ اپنی جگہ برقرار ہے اور مرضیٔ الٰہی کے بغیر ہل نہیں سکتی۔

**ان اللہ یمسک السموت والارض ان تزولاولئن زالتا ان
امسکھما من احد من بعد ہ انہ کان حلیما غفورا** (فاطر۔ ۴۱)

''اللہ آسمانوں اور زمین کو یقیناً تھامے رکھتا ہے کہ یہ اپنی جگہ نہ چھوڑ جائیں۔
اگر یہ اپنی جگہ چھوڑ جائیں تو سوائے اللہ کے انھیں کوئی تھامنے والا نہیں۔
یقیناً اللہ بڑا حلیم اور بخشش کرنے والا ہے۔''

تو بیٹے، کائنات کا یہ توازن باری تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں۔ وہی ہے جو تمام مخلوقات اور اشیاء کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ قیامت کے روز زمین بحکمِ خداوندی اپنے حالات خود بیان کرے گی۔ قرآنِ کریم میں انسان کی پیدائش پر بات کرتے ہوئے خالقِ اکبر فرماتا ہے:

ایحسب الانسان الن نجمع عظامه (القیٰمه۔ ۳)

''کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔''

وانظر الی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما (البقرۃ۔۲۵۹)

''پھر ان ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انھیں اٹھا کر پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔''

گویا قرآن وجودِ خدا کی دلیلیں بھی دیتا ہے، توحید کو مرکزی نقطۂ کائنات بھی کہتا ہے اور محسوس دلیلوں کے ذریعے اللہ کی حقانیت بھی ثابت کرتا ہے۔ سورۂ انعام، سورۂ بقرہ، سورۂ نحل، سورۂ حج، سورۂ قصص، سورۂ ابراہیم اور سورۂ یونس میں تو باقاعدہ وجودِ الٰہی کے ثبوت ہیں جبکہ باقی سورتوں میں بھی اس موضوع پر آیات ملتی ہیں۔ اسی طرح سورۂ آلِ عمران، سورۂ اخلاص، سورۂ انبیاء، سورۂ مومنون اور دیگر میں توحید کی دلیلیں موجود ہیں۔ سورۂ زمر، سورۃ الرعد اور سورۃ المائدہ میں تو ربِ ذوالجلال نے توحید کی قسمیں بھی بیان فرمادی ہیں۔ بقائے ذات اور اللہ کے اسماء وصفات کا نہایت واضح اور دلکش بیان سورہ 'مومن، حشر، اعراف، روم، یوسف، حدید، بنی اسرائیل اور نساء' میں مرقوم ہے۔ مزید یہ کہ سورہ 'زخرف، کہف، جاثیہ، فرقان، عنکبوت اور مومن' میں آپ کو ذکر اللہ اور حکمت اللہ کے متعلق بہت ساری ہدایات ملیں گی جن کی روشنی میں ایک مسلمان اپنی منزل تک بخیر وخوبی اور سلامتیٔ ایمان کے ساتھ پہنچ سکتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی عظمت کے ثبوت پر سورۂ حشر، سورۂ توبہ، سورۂ الم نشرح، سورۂ نجم، سورۂ قصص اور سورۂ ہود کے علاوہ بھی کئی مقامات پر آیات موجود ہیں جن سے آپ ﷺ کا خاتم النبیینؐ ہونا اور پہلی کتابوں میں آپؐ کے ذکر کا ثبوت ملتا ہے۔'' یہاں حضرت

زیدؓ نے خاموشی اختیار فرمائی تو میں نے بیان جاری رکھنے کی درخواست کی۔ اس پر انھوں نے فرمایا..... "مجھے اتنی ہی ہدایت کی گئی تھی۔ انشاء اللہ تعالیٰ قرآنی تعلیمات کی اگلی منازل آپ بفضلِ الٰہی خود طے کرلیں گے۔ اللہ آپ کا نگہبان ہو۔ جب دربارِ رسالتؐ میں حاضری ہوتو میری طرف سے عرض کردیجیے گا کہ زید بن ثابتؓ نے اپنا فرض نبھادیا ہے۔" مسافر نے آپؓ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور آگے بڑھا۔

مقامِ شکر ہے کہ اللہ کریم نے اپنے اس حقیر بندے پر بے پایاں احسان کیا اور اسے اعزازات عطا کر کے اس قابل بنایا کہ خدمتِ دین میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ برزخ سے جو انعامات وتحائف ملے ان کا احاطہ اختصار سے ممکن ہی نہیں۔ کئی واقعات وکرامات کی تصدیق ہوئی اور نبی کریم ﷺ کے عشق کے صدقے "محبّ الرسول ﷺ" کا لقب بھی عطا کیا گیا۔ تاہم اس حقیقت کا اعتراف مجھ پر لازم ہے کہ نبی کریمؐ کی نظرِکرم اور میرے شیخِ محترم کی توجہ شاملِ حال نہ ہوتی تو اس باسعادت مسافت کا اعزاز کبھی حاصل نہ ہوتا اور درس کی یہ نعمتیں میسّر نہ آتیں۔

مسافتِ برزخ کے بعد سیر الافلاک آغاز ہوئی تو پہلے فلک سے ہوتا ہوا یہ عاجز دوسرے فلک پر پہنچا جہاں ہر طرف سیاہ وسفید منظر تھا۔ حقیقتِ فکریہ کی چہار سُو پھیلی خوشبو میں 'یاقدیرُ' کی آواز سُنی اور پیروی کی۔ علیم وخبیر کی حقیقت اور قدیر کی ہیبت اس فلک میں ظاہر ہے۔ یہاں فقیر نے اہلِ ہُنر کی نُصرت پر مامور فرشتوں کو دیکھا جو ایجادات واختراعات میں اُن کی معاونت کرتے ہیں۔ یہاں کے ملائکہ اپنے مقام پر رہتے ہوئے بھی دوسرے فلک کے فرشتوں کی صدائیں سُنتے ہیں۔ فلک دوم میں فقیر کے مشاہدات اس نوع کے ہیں کہ رحمت اور کرم ہی اصطلاحی سطح پر انھیں بیان کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر رحمانیت کا سیاق وسباق واضح ہوتا ہے اور ایسے فرشتوں کا دیدار ہوتا ہے جو نورانی تاجوں کے ساتھ اڑان کرتے ہیں اور ان کا اذنِ پرواز ساتوں افلاک تک بار پا سکتا ہے۔ یہاں سمجھتے چلیں کہ لغت کے اعتبار سے 'فلک' اور 'آسمان' ہم معنی

الفاظ ہیں لیکن حقیقی طور پر یہ ایک دوسرے کے مترادف نہیں۔ ہر فلک کے سات آسمان ہیں۔ آسمان کی حیثیت فلک کے مقابل ذیلی ہے تاہم راقم یہاں ہر فلک کی مجموعی کیفیت ہی بیان کرے گا۔

فلکِ دوم پر ہر طرف معرفت و کرامت کا ظہور ہے اور ایسے قدسی ہیں جو مخصوص عبادات میں مصروف ہیں۔ یہ باری تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہاں پر متمکن حضرت نوح علیہ السلام اور فلکِ ہفتم پر جلوہ نشیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فیوض و برکات اسی فلک سے ایک سالک کے دل پر وارد ہوتے ہیں۔ حضرت نوحؑ نے عنایات کے ذریعے فقیر پر کرم نوازی کی اور فرمایا ''کچھ امانتیں شیخ چوگانیؒ (گجرات والے)، حضرت طانوخؑ اور حضرت امنونؑ کے پاس رکھی ہیں، واپسی پہ انھیں لیتے جانا۔'' تسلیمات کے ساتھ تحائف کا شکریہ ادا کیا تو فرمایا...... ''ابھی اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام اور پاکستان کے لیے آپ سے بہت سارے کام لینے ہیں۔ مُبارک ہو کہ آپ نبی کریم ﷺ کی چشمِ توجہ کے باعث چُن لیے گئے۔'' پھر حضرتؑ نے اس فلک کے مختلف اسرار سے آگاہ کیا کہ اس کے سفید و سیاہ رنگ کا سبب کیا ہے اور کیسے یہاں کے فرشتے ارواح اور اجسام کو باہم ملا دیتے ہیں۔

تصوف کے طالب علم کو یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کا بیان احاطے میں نہیں آ سکتا۔ وہ بے حد ہونے کے علاوہ جلالِ مطلق، جمالِ مطلق اور کمالِ مطلق بھی ہے۔ کائنات ابھی درجۂ ارتقاء میں ہے اور رہے گی کیونکہ کمالِ مطلق تک پہنچنا اس کے لیے محال ہے۔ دراصل خود حق بھی ترقی پر ہے کہ خلق کے سامنے اس کا ظہور ابھی مکمل نہیں ہوا۔ 'کل یوم ھو فی شان' اسی جانب اشارہ ہے۔ بے شک اللہ کریم کی شان ہر دم نئی ہے اور اس کے پیدا کردہ مظاہر میں اس قدر تنوّع ہے کہ کھربوں برس دیکھتے رہو تو

رعنائی اور جہتیں ختم نہ ہوں۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے پا کر عارف توسّل اور وصل کے لیے
بے قرار ہو جاتا ہے۔ معرفت کی اصل یہی تو ہے کہ مظاہر کی نوعیت اور ماہیت اسے
خالق سے جوڑ دے۔ یہ جھومتے درخت اور لچکتے نہال، مہکتے شگوفے اور کلام کرتے
پھول، زمزمہ کرتے طائر اور کلیلیں کرتے غزال غرض کہ ہر جاندار اور بظاہر بے جان
مخلوق اس ذاتِ واحد کا ثبوت ہے جو ان سے بے نیاز بھی ہے اور انتہائی نگہبان بھی۔
روحانی مسافت میں مظاہر کی اصل اور حقیقت کھل جاتی ہے۔ مگر یاد رہے کہ سالک کا
شوق اور مجاہدہ ان معارف تک اسی وقت رسائی پا سکتا ہے جب مرشدِ کامل کی نگاہ
اسے کیمیا کر دے۔ اللہ کا فضل و کرم عارف کے ساتھ ہو تو فاصلے مٹ جاتے ہیں اور
من و تُو کا فرق محسوس ہی نہیں ہوتا۔ فقیر نے توفیق الٰہی کے مطابق نورِ محمدی ﷺ کی ضیاء
میں مظاہر کا اصلی بانکپن دیکھا اور سبحان اللہ کی تسبیح کرتا رہا۔ دوسرے فلک کے برق
رفتار شہابیے اور مشرکین پر ان کا بموں کی طرح گرنا دیکھا۔ یہ مشرکوں کے حواریوں
کو خاکستر بنا دیتے ہیں اور نورِ احمدِ مُرسل ؐ کی شان سالک پر عیاں ہوتی جاتی ہے۔ ایسی
ہی کیفیت ارضی سطح پر اس وقت رونما ہوتی ہے جب عارف منکرینِ ختمِ نبوت کے
سامنے درود شریف کا ورد با آوازِ بلند کرتا ہے تو ان کے سیاہ دل راکھ ہو جاتے ہیں۔
فقیر کی دعا ہے کہ شمعِ رسالت کا طواف کرنے والوں کا یہ سوز سلامت رہے اور وہ اسوۂ
رسول ﷺ پر عمل پیرا ہو کر اس تجلّی کردار کو فروغ دیں جو رسالت مآب ﷺ کا انکار کرنے
والوں کے لیے ہدایت کا باعث بنے۔

اس مسافت میں مجھے حضرت نوحؑ کے سامنے سورۃ نوح کی تلاوت کا شرف بھی
حاصل ہوا۔ آپؑ نے اس کا اذن دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کی تلاوت دشمنوں اور
حاسدوں پر غلبہ پانے اور چڑھے ہوئے پانی کو شانت رکھنے کے لیے نہایت اکسیر ہے۔

اگلی منزل میں محبت ہی محبت تھی۔ یہ تیسرا فلک ہے۔ یہاں محبت پھونکنے والے فرشتے ہیں جن کا رُوپ سراسر جمال اور حُب ہے اوران کی اتنی صورتیں ہیں کہ شمار ممکن نہیں۔ ان فرشتوں پر ملک صورائیل حاکم ہیں۔ اسے فلکِ زہرہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں معلوم ہوا کہ خیال حقیقت کا عکس نہیں، خود ایک حقیقت ہے۔ اس زردی مائل آسمان کے عجائب مثالی (آئیڈیل) سطح پر ظہور پذیر ہونے کے باعث انسانی فہم میں نہیں سما سکتے۔ یہاں کے ملائکہ انسانی آوازوں کو پوری طرح نہ صرف سنتے ہیں بلکہ پاکبازوں کو جواب بھی دیتے ہیں۔ ان فرشتوں کے ذمے مختلف کام ہیں جو معاونت اور موانست سے متعلق ہیں۔ تربیّت، تسلی، دلاسا اور غم خواری اس مخلوق کے سپرد ہیں۔ یہاں وہ صورتیں ہیں جو محبت کے چراغ جلاتی اور عشق کو فروغ دیتی ہیں۔ اس مقام پر حکمِ الٰہی سے خوابوں کی درست اور اصل تعبیر بتانے والے حضرت یوسفؑ ایک تخت پر تشریف فرما ہیں۔ آپؑ نے اس عاجز کے سلام پر جواب سے نوازا اور سورۃ الضحیٰ کا اذن عطا کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی بکثرت تلاوت متاعِ گم گشتہ کی بازیافت کے لیے مفید ہے۔ آپؑ نے اس فقیر کو تعبیر کا اذن تحفہ کیا اور نوید دی کہ انشاءاللہ خواب کی صحیح تعبیر کا یہ سلسلہ آپ کی اولاد میں بھی جاری رہے گا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سورۃ الضحیٰ کے متعلق حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی جب حضرت جبرائیلؑ کی آمد کا سلسلہ کچھ عرصہ موقوف رہا اور مشرکین نے مشہور کر دیا کہ نعوذ باللہ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اس پر اللہ کریم نے سورۃ الضحیٰ اتارا، متوسلین کو ہدایت ہے کہ روزانہ ایک بار اس سورۃ کی تلاوت کا شرف ضرور حاصل کریں۔

سالک کے لیے فلکِ سوم کی کیفیت میں اتنا جاننا لازمی ہے کہ یہاں عالم اور جاہل دونوں کا گزر ممکن نہیں۔ بس عارف ہے کہ متاعِ عشق کے صدقے ہمہ وقت

محوِ سفر رہتا ہے۔ مظاہر کا پردۂ چشم پر حاوی ہو جانا عشق کی ابتدائی منزل ہے جبکہ اگلے سفر میں مظاہر کی نوعیت و ماہیت زائر اور ناظر سے کلام کرتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی سالک کا اثاثہ اس ضمن میں کافی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ربِّ کریم اسے اس آسمان سے دور رکھے۔ یہاں انوار کی رمزیں اور معنی کے پردے پوری طرح کھل جاتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں عاشق محبوب کی صورت دیکھ سکتا ہے لیکن توفیق کے حامل یہیں نہیں رک جاتے کیونکہ یہ صورتیں عارف کو روک نہیں سکتیں۔ زہرہ مجازی عاشقوں کا محل ہے، حقیقی مومن کی معراج نہیں لیکن یاد رہے کہ ہر مجازی مبتلا بھی یہاں تک رسائی نہیں رکھتا۔

جدید تعلیم یافتہ لوگ سمجھ لیں کہ یونانی تصورِ عشق و محبت دراصل فلکِ زہرہ ہی کی ایک بگڑی ہوئی جہت ہے۔ انھوں نے صرف کیوپڈ دیوتا (Cupid) کا شوشہ گھڑ لیا جو ان کے بقول دو دلوں میں محبت کا تیر چلاتا اور ان میں محبت پیدا کرتا ہے۔ فقیر اس لایعنی تصور پر صرف اتنا تبصرہ کرتا ہے کہ عشق کوئی اختیاری جذبہ نہیں کہ اس میں ارادۃً مبتلا ہوا جا سکے یا نکلا جا سکے۔ وہ لوگ جو رواجاً یونانی عقیدے سے متاثر ہو جاتے ہیں کتابی علم سے آگے نہیں جا سکتے اور کتابی علم بہر حال حقیقی علم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی مسافت کے لیے زمینی پیمائشیں کام نہیں آتیں۔ شائق اور سالک پر لازم ہے کہ جن مخلوقات و مظاہر کا بیان پڑھ رہا ہے ان کی موجودگی پر ظن و گمان سے بچے۔ ایسا پرہیز صائب ہے اور سود مند بھی۔ بصورتِ دیگر نقصان اور ایمان کے زیاں کا احتمال ہے۔ ملائکہ کی جن جن حالتوں کا ذکر ہوا ہے وہ حق بین آنکھ ہی کے مشاہدے میں آ سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ پاک ہے:

الذین یحملون العرش و من حولہ یسبحون بحمد ربھم

و يؤمنون به و يستغفرون للذين امنو ربنا وسعت كل شئی رحمة و علما فاغفرللذين تابو واتبعو اسبيلك (المومن۔۷)

''اور وہ فرشتے جو عرش اٹھاتے ہیں اور جو اس کے ارد گرد ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور اس پہ ایمان لاتے ہیں اور مومنوں کے لیے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب تیری رحمت اور علم میں ہر شے سمائی ہے تو انھیں بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے۔''

ہمارا ایمان ہے کہ ملائکہ کو جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں وہ ان کی انجام دہی میں قطعاً کوئی غلطی نہیں کر سکتے گویا ان کی مرضی اور اختیار ہے ہی نہیں۔ ملائکہ اس قدر صورتوں کے حامل تھے کہ ان کا بیان ناممکن ہے۔ بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے اور یہ صرف اسی کے دائرہ اختیار میں ہے کہ ایک ایک مخلوق میں لاتعداد جلوے اور ان گنت جہتیں رکھ دے۔

فقیر کا اگلا پڑاؤ نجوم کا مآخذ تھا۔ وہ جگہ جہاں روشنی کی افراط ہے اور اس کی بنیاد دل ہے۔ یہاں الوہیت اپنی عجب شان سے جلوہ گر ہے۔ یہیں سے انوارات نازل ہوتے ہیں اور قلب کی حقیقت سالک پر متجلّی ہوتی ہے۔ یہ چوتھا فلک ہے جہاں حضرت اسرافیلؑ ملائکہ کے حاکم ہیں۔ اللہ نے سارا انتظام ان کے تصرف میں دے رکھا ہے اور آپؑ کی رسائی تحت الثریٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔ حضرت اسرافیلؑ مرتبے اور ہمّت کے اعتبار سے تمام ماتحت فرشتوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ فلک چہارم کا آفتاب اللہ تعالیٰ کے پاک اوصاف کا جلوہ خانہ ہے۔ اس کا محیط بہت روشن و منور ہے جس میں ہر سو قلب کا نور رواں ہے۔ یہاں حضرت ادریس علیہ السلام رونق آراء ہیں۔

حضرت داؤد و سلیمان علیہم السلام وغیرہم اپنے اپنے مخصوص مقامات پر اُن کے ہم فلک ہیں اور انوار و اسرار سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ سب نے اس عاجز کو شرف بخشا اور رہبری فرمائی۔ حضرت سلیمانؑ نے مخصوص و منفرد اسمائے ربانی میں سے کچھ راقم کو بھی عطا فرمائے جبکہ حضرت داؤدؑ نے چند پاکستانی اربابِ اختیار کے لیے پند و نصائح کی امانت سونپی جو روحانی طور پر متعلقہ لوگوں تک پہنچا دی گئی۔

حضرت عیسیٰؑ روح اللہ نے اذنِ شفا بخشا اور خبردار کیا کہ ایک وقت آئے گا جب آپ کو بطور امتحان ایک زندہ آدمی کا جنازہ پڑھانے کو کہا جائے گا۔ پھر اس شخص کے خدوخال بیان فرماتے ہوئے اس چال سے باخبر رہنے کی تلقین فرمائی۔ مزید فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی، ہر دور میں اہل اللہ کی آزمائش کے لیے طاغوتی ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ حضرت علیؑ کو آزمانے کے لیے بھی منکرین نے یہی حربہ آزمایا تھا۔ آپؓ کے جنازہ پڑھانے پر وہ شخص حقیقتاً مر گیا تو گریہ وزاری کرنے لگے۔ یہ سن کر مجھے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حوالے سے 'اخبار الاخیار' میں درج اسی طرح کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ فقیر حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ گرہ میں باندھ کر آگے روانہ ہوا اور بعد ازاں اللہ کے فضل و کرم سے یوں سرخرو ہوا کہ سازش کرنے والوں میں سے ایک صاحب میرے پاس آئے اور تمام ماجرا سنا ڈالا۔ پھر روتے ہوئے بتایا کہ انھیں حضرت علی المرتضیٰؓ کی زیارت ہوئی اور انھوں نے سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر وہ لوگ باز نہ آئے تو مردہ خاندانوں کے وارث ہوں گے۔ فقیر نے اس کے معافی مانگنے پر پردہ پوشی کا وعدہ کرتے ہوئے تسلی دی اور آئندہ محتاط رہنے کی ہدایت کی۔

چوتھے فلک کا رنگ احمریں ہے اور اس لہو رنگ فضا پر ہر جانب رعب، دبدبے اور جلال کی حکمرانی ہے۔ اس فلک کے ملائکہ عابدوں کو حضوری کی طرف رغبت دلاتے

اور امکان کو واقعیت عطا کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ دلوں میں عشق و ایمان کی پختگی بھی ان فرشتوں کے فرائض میں شامل ہے۔ اہل اللہ کی نصرت و امداد کے لیے فرشتے بھی اسی فلک سے اترتے ہیں جن کے حاکم ملک الموت یعنی حضرت عزرائیلؑ ہیں۔ سلام کرنے پر حضرت یحییٰؑ نے فرمایا کہ جنگِ بدر میں یہیں کی نوری مخلوق نے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفٰے ﷺ کے لشکر کی نصرت کی تھی۔ پھر آپؑ نے فقیر کو سورۃ سجدہ کا اذن بھی عطا کیا۔ یہ وہ سورۃ ہے جسے نبی کریمؐ بہت کثرت سے تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ اس سورۃ کو دیگر سورتوں پر ساٹھ درجے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔

حضرت یحییٰؑ نے مُسافر کو بہت سے اسم بھی تعلیم فرمائے۔ علم کا معاملہ یہ ہے کہ معارف سے پست مگر باقی درجات سے بلند ہے یعنی عارف کی طبیعت پر اکسیر کا کام کرتا ہے اور یوں صیقل کرتا ہے کہ طِلا ماند پڑ جائے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

العلماء ورثۃ الانبیاء

''علماء، انبیاء کے وارث ہیں۔'' (مشکوۃ شریف)

یہاں عالم سے مراد محض درسی علم کے حامل نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو علمِ حقیقی سے آراستہ ہوں، اور حقیقی علم وہ ہے جو دین کے تینوں اجزاء (اسلام، ایمان اور احسان) کا مرکب ہو، انسان کو اپنی پہچان کرائے اور خالقِ حقیقی سے ملائے۔ مگر یاد رہے کہ اس علم کا حصول عشق کی جوت جگائے بغیر ممکن نہیں۔

علم مشکل باتوں کو سہولت سے کہنے کا نام ہے۔ یہ معرفتِ الٰہی کے اوّلین درجوں میں سے ایک ہے۔ جذب والے فقیر علم والے عارفوں سے درجہ میں علم کے سبب ہی کم ہیں۔ علم کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ طالب علم اگر مراد نہ پا سکے تو بھی اجر کا مستحق ٹھہرتا ہے جیسا کہ طبرانی وغیرہ میں بالتحقیق آیا ہے۔

من طلب علما ما درکه، کتب الله له کفلین من الاجر،

ومن طلب علما فلم یدرکہ کتب اللہ کفلا من الاجر

''جو شخص علم کی تلاش میں نکلے اور اسے حاصل بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دو اجر لکھ دیتا ہے اور جو شخص علم کا جویا ہو مگر اس کو حاصل نہ کر سکے ربّ کائنات اس کے لیے ایک اجر لکھ دیتا ہے۔''

پیغمبرِ برحق حضرت یحیٰؑ نے فقیر کے آئندگان کو دُعا دیتے ہوئے اس فلک کے ملائکہ کے ساتھ شاملِ تسبیح ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ عظمت و جلال کی فضا میں حق سبحانہ تعالیٰ کا ذکر کیسی دل کش کیفیت رکھتا ہے۔ یوں محسوس ہوا کہ بدن نام کی کوئی شے اس پل موجود نہیں بس روح کا ایک ہنڈولہ ہے جو اسمِ ذات کے ورد کے ساتھ پورے فلک میں گردش کرتا ہے اور نجوم ایک خاص لے میں شریکِ ذکر ہوتے ہیں۔ مشاہدہ کیا کہ ہر جانب اسمِ شافی کی لہریں موجزن ہیں اور 'ھوالشافی' اور 'اللہ الشافی' کی تجلیات ہر غم کو سینے سے دھو رہی ہیں۔ فقیر کو بتایا گیا کہ اسمِ ذات ہی میں اسمِ شافی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کیا جانے والا ہر کام نہ صرف آلودگی سے پاک اور آسودگی کا باعث ہوتا ہے بلکہ بسم اللہ شریف کا ورد ہر جسمانی و روحانی رنج و مرض کا مداوا بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہوا کہ جب ہم بسم اللہ کی تلاوت کرتے ہیں تو گواہی دیتے ہیں کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہی ہر کام میں برکت عطا کرنے اور آلام سے بچانے والا ہے۔ یہاں یہ اقرار بھی مخفی ہے کہ بے شک شفا من جانب اللہ ہے۔

پانچویں فلک کی نوری حالتوں کا احاطہ الفاظ نہیں کر سکتے۔ یہاں مادے کا تصور مفقود اور ہیچ ہے۔ سجل مناظر میں بوجھ اور گرانی کا احساس بالکل نہیں ہوتا حالانکہ

طمطراق اور دبدبہ گرانی پیدا کرتا ہے۔

مسافر کا اگلا پڑاؤ فلکِ ششم تھا۔ یہاں کے ملائکہ سارے اسماء وصفاتِ الٰہی و نبویؐ کے موتیوں کی تسبیح میں مشغول ہیں جن کی رنگینی اور رعنائی دلوں کو تسخیر کرتی ہے۔ آواز آئی کہ اے مسافر موتی چُن، جتنے چُن سکتا ہے۔ عاجز نے حکم کے مطابق بساط بھر خیرات لی تو دیکھا کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ رونق افزا ہیں اور ایک مستی ازلی سے میری جانب ملتفت ہیں۔ فرمایا...... "آپ مجھے پہچانتے ہیں؟" الحمد للہ عطائے محمدی ﷺ کے سبب فقیر خبردار تھا اور صاحبِ 'لن ترانی' کی شان جانتا تھا۔ سلام کیا اور عرض کی....... "اے ربِ اَرنی کہنے والے! آپ ہی تو فرعونیت کو خاک میں ملانے اور اللہ کے حکم سے ربوبیت کے اسرار و انوار کے رمز شناس ہیں۔ آپ ہی کا فیض فلکِ سوم سے ایک ذاکر کے قلب کو منور کرتا ہے۔" یہ سُننا تھا کہ کلیم اللہ کے چہرۂ مقدس پر الحمد کا نور رفزوں ہو گیا اور ارشاد کیا"..... پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے محبوب ﷺ کے امتیوں کو ایسے مقامات عطا فرمائے جن کا گمان بھی بنی اسرائیل کے پاکیزہ نفوس نہیں کر سکتے۔" عرض کیا...... "اے مرتبۂ ششم والی پاکیزہ ہستی، حدیثِ خاتم الانبیاؐ اس ضمن میں حجت ہے اور بے شک آپ کی گواہی معتبر ترین۔"

دیکھا کہ آپؑ کا دستِ مبارکہ بلند ہوا اور ایک عصا نکل کر یوں میری جانب آیا گویا ہوا میں تیر رہا ہو۔ جب عصا میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھنے لگا تو سرکارِ دو عالم ﷺ کی آوازِ مبارکہ زینت گوش ہوئی، "بیٹے اسے تھام لو۔" میں نے تعمیل کی تو حضرت موسیٰؑ کے رُوئے مبارک پر تبسم کی لکیر ابھری اور فرمایا "یہ دلیل اور زُہد کا عصا ہے۔ اسے رکھیے اور منکرین کی سرکوبی کیجیے۔" میں نے عرض کی "حضرتؑ! عشقِ مصطفٰیؐ ہر حالت میں حاجت روا ہے اور باری تعالیٰ کا احسان ہے کہ نبی کریمؐ کا ادنیٰ

اُمتی ہوں البتہ عطائے ربانی اور فرمانِ حضورؐ پر سر جھکاتے ہوئے شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔'' اس پر آپؑ نے فرمایا...... ''امام الانبیاء ﷺ کے فقیروں کا استغناء اور قناعت ہی امتِ مسلمہ کا سرمایہ ہے۔''

یہ فلک سارے افلاک میں دوسرے مرتبہ پر پیدا کیا گیا۔ یہی مقامِ میکائیل ہے اور وہ یہاں کے سب فرشتوں کے سردار ہیں۔ یہ ملائکہ حکمِ الٰہی سے انبیاء اور اولیاء کی منازل کے ذمہ دار ہیں اور ان کے مراتب میں ترقی کے لیے خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان فرشتوں میں رحمت، اسراریت، شفا، فروغِ دُعا اور رفعِ کفر کی صفات ہیں جو اہلِ زمین کے لیے وجہِ فضل و کرم ہیں۔ یہاں بھی ملاحظہ کیا کہ ملائکہ اتنی شکلوں میں ہیں جن کا شمار ممکن نہیں اور ربِ قادر وقدیر نے انھیں یوں خلق فرمایا کہ فہمِ انسان تعبیر و تفسیر سے عاجز ہے۔ اللہ اکبر۔ بعض تو ایسے ہیں کہ انھیں آتش اور یخ بستہ پانی سے پیدا کیا گیا۔ شاید پڑھنے والا اسے اجتماعِ ضدین جان کر ظن و گمان میں پڑ جائے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ امرِ الٰہی ہے کہ آبِ یخ زدہ اپنی حد سے متجاوز ہو کر رواں نہیں ہو سکتا اور اسی ہیئت پر برقرار رہتا ہے جس پر خلق کیا گیا۔ اسی طرح آتش کا جوہر جلانا ہے لیکن اسی کیفیت میں برقرار ہے جو اسے امر کی گئی۔ سالک دیکھے گا کہ کیسے نصف حصہ آتش اور نصف حصہ یخ تعینات میں ہے۔ بہت سے ایسے ہیں کہ حیوانات و طیور کی صورتوں میں ہیں۔ یہ دنیاوی اعتبار سے کم مرتبہ لوگوں کی دلجوئی پہ مامور ہیں اور شکستگی دور کر کے عبادت و ریاضت کا شوق دلوں میں ڈالتے ہیں۔ غرض یہاں کا ہر مقام اللہ اکبر، سبحان اللہ اور نغمۂ توحید کا مظہر ہے۔

عاجز نے حضرت میکائیلؑ کے ساتھ مل کر جناب رسالت مآبؐ پر درود بھیجا۔ آپؑ نے فرمایا...... ''یہ فلک ساتویں کے سوا سب پر محیط ہے اور مقامِ براقِ مصطفیٰ ﷺ

ہے مگر وہ یہاں کی مخلوق نہیں البتہ باقی تمام انبیاءؑ کی سواریاں اسی فلک سے ہیں......
آپ کے شیخ حضرت باغ حسین کمالؒ بھی جب یہاں تشریف لائے تھے تو درود شریف کی ایسی ہی محفل بجی تھی۔ آپ کو نوید ہو کہ اس سے پہلے یہ مرتبہ کسی باپ بیٹے کو نصیب نہیں ہوا۔'' میں نے عرض کی ''اے پروردگار کی برگزیدہ مخلوق، یہ سب اللہ کا کرم اور حضورؐ کی عطا و رحمت ہے ورنہ زہد و عبادت میں کتنے ہیں کہ افضل و محترم ہیں۔''

ساتویں فلک کو باری تعالیٰ نے عقل کے نور سے خلق فرمایا اور وہ عقلِ اوّل ہے جو تمام عقول پر حاوی ہے۔ یہ فلک تمام عالم اور موجودات سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ یہاں زائر نے ان نجوم کا بھی مشاہدہ کیا جن کی شناخت ہر ایک کو نہیں ہو سکتی اور چشمِ ظاہر بیں پر ان کی رفتار نہیں کھلتی۔ یہاں کا منظر بہت مہیب، خوفناک اور عبرتناک ہے۔ یہ ارواحِ رذیلہ کی قیام گاہ ہے۔ اس مقام پر ہر جانب شبِ دیجور کا گمان ہوتا ہے جو سالک کے لیے کنایہ ہے کہ عقلِ کل اور فہمِ مکمل کی پہچان ناممکن ہے۔ حضرت جبریلِ امینؑ، حضرت عزرائیلؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت اسرافیلؑ اور رتبے میں فضیلت و شرف کے حامل دیگر ملائکہ یہیں پر رہتے ہوئے اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہیں۔ یہاں ایک اور عالی مرتبت فرشتے کا دیدار بھی نصیب ہوا۔ میں نے انھیں دیکھ کر سورۃ اخلاص تلاوت کی اور درود شریف ہدیہ کر کے عرض گزار ہوا.....

''شکر ہے اللہ کا جس نے نبی کریمؐ کے صدقے تمام جہانوں کو خلق کیا اور مبارک ہے وہ صلب جس میں آپؐ کا نور رکھا گیا تا کہ آپؐ عالمِ انسانی میں تشریف لائیں۔ پاک ہے وہ باپ جو حاملِ نورِ محمدیؐ تھا اور یقیناً طاہرہ ہے وہ بی بی جس کا شکم جوہرِ مصطفیٰ ﷺ سنبھالے ہوئے تھا۔'' اللہ اللہ، یہ سننا تھا کہ منتظم فرشتوں کے سرخیل حضرت جبرائیلؑ آگے بڑھے اور فرمایا ..... ''یہ عبداللہ ہیں، عبادات کے لحاظ سے

ملائکہ میں سب پر مقدم۔" میں نے ایمانِ مفصّل اور ایمانِ مجمّل پڑھا تو حضرت عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا..... "اسماء کی مماثلت لازمی طور پر امر واقعہ کی طرف نہیں جاتی۔ اتنا ہے کہ پروردگارِ عالم نے اپنے محبوب ﷺ کے صدقے ہی مجھے یہ مبارک نام عطا کیا ہے۔ آپ کی نسبت کو سلام ہو کہ آپ نے اِذنِ عشق کے باعث یہ معرفت حاصل کی۔"

یہ فلک کرسی خلیل اللہ کا حامل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ یہیں رونق آرا ہیں۔ فقیر آپؑ کی خدمت میں پہنچا اور سلام بھیجا۔ آپؑ نے جواب سے نوازا اور پھر خاتم الانبیاء ﷺ پر درود پڑھ کر فرمایا..... "بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری دُعا کو مستجاب کیا اور حضرت محمد ﷺ کو میری آل میں رکھ کر لطف واحسان کی حد کر دی۔ جب سے یہاں ہوں اسی ایک نعمت کا شکر کیے جاتا ہوں، دیگر احسانات کا شکریہ جانے کب ادا ہو۔" عرض کیا..... "اے معمارِ کعبۃ اللہ! پروردگار نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی قبول فرماتے ہوئے دُنبہ بھیج دیا مگر قربانی کا التواء منظور نہ کیا۔ یہ رُتبہ بُلند بھی آپ ہی کو نصیب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے فرزند حضرت امام حسینؓ پر قربانی تمام کر دی۔"

اتنا کہنا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی مُبارک آنکھوں میں اشک چمکنے لگے۔ فرمایا "ظالموں کا یومِ حساب دور نہیں۔ میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ اس ایک کلمۂ خیر وخلوص کی برکت سے آپ کے متوسّل کشت وفساد سے محفوظ رہیں گے اور باطل آپ پر غالب نہیں آ سکے گا۔" اس کے بعد خلیل اللہ نے ایک ریزۂ سنگ عطا کیا اور فرمایا "یہ وہ مبارک پتھر ہے جو حجرِ اسود کے بعد بنیادِ کعبہ میں نصب ہوا۔ باقی حصہ محفوظ ہے جبکہ یہ آپ کے لیے صدیوں سے رکھا ہوا تھا۔"

میں گریہ کناں تھا اور حمد وثنا کے پھول میرے ہونٹوں سے جھڑ رہے تھے۔ شکریہ کے ساتھ یہ سوغات لی اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے عرض گزار ہوا..... "بے شک آپ کنیزوں اور غلاموں کو عزت دینے والے ہیں۔ آپؐ نے حضرت حاجرہؓ کی حیثیت کا خیال کیا اور انھیں تکریم و محبت دی۔ اللہ جسے چاہے عزت و توقیر عطا کرتا ہے۔ اس نے صفا اور مروہ پر اس پاک بی بی کی تلاشِ آب میں بے چینی سے دوڑ دھوپ اتنی پسند فرمائی کہ سعی حج کا اہم ترین جزو قرار پائی۔ بے شک سعی کو پیغمبروں نے سُنت بنایا اور یہ ذکر کی عملی صُورت ہے۔ جیسے تحصیلِ علم، حصول رزقِ حلال اور ترویجِ دین۔" اسی دوران فقیر کے دل میں ترمذی شریف کی ایک حدیثِ قدسی روشن ہوگئی:

قال رسول الله يقول الرب تبارك تعالى من شغل القرآن عن ذكري، و مسالتي اعطيته، افضل ما اعطى السائلين، و فضل كلام الله على سائر الكلام كفضل الله على خلقه

"(حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ) رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیثِ قدسی بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" جس شخص کو قرآن شریف کی مصروفیت کی وجہ سے ذکر کرنے اور دُعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں۔ اللہ کے کلام کو سارے کلاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسے خود اللہ کو تمام مخلوق پر فضیلت ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ قول و فعل اور نیّت کے حوالے سے ذکر کی جن سماجی اقسام پر میں

سوچتا ہوں وہ بھی مستحسن کام ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

''بے شک کوئی بھی اچھا عمل جس سے انسانیت کا بھلا ہو اور باری تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب بنے ذکر ہی کے زمرے میں آتا ہے لیکن تنہائی میں بیٹھ کر ذکرِ اسمِ ذات کا کوئی نعم البدل نہیں۔ مبارک ہو کہ آپ نے ذکر کے باب میں باریک نکات کو جان لیا اور حمدِ باری تعالیٰ کی نئی جہت پیدا کی۔'' میں نے گزارش کی ..... ''وہ ذات ہر پہلو اور تعریف سے ورا ہے بس اتنا ہے کہ فقیر کی ایجادِ طبع بھی اُسی کی دین اور عطا ہے۔''

راقم نے افلاک اور اس کے آسمانوں کا رقبہ اس لیے بیان نہیں کیا کہ ہر فلک کی مسافت برسوں قرنوں کو محیط ہے اور صرف پڑھنے سُننے سے اُن کا ارض و بسط ادراک میں نہیں سما سکتا۔ اگرچہ چند کتبِ عالیہ میں محیط و مُسافت کا ذکر میکانکی پیمائش کی طرح کیا گیا ہے تاہم فقیر کا خیال ہے کہ بس ایمانِ کامل ہی اس باب میں رہنمائی کر سکتا ہے۔ فقیر نے افلاک پر جو کچھ بھی ملاحظہ کیا اس میں نظم اور ترتیب کا عنصر ہر حال میں دامن کش اور دلچسپ تھا۔ دیکھا کہ نُوری مشعل برداروں میں سے ایک فرشتہ میری جانب بڑھ رہا ہے اور اس نے اسمِ ذات بلند کر رکھا ہے۔ حکمِ خلیلؑ کی تعمیل میں اپنے ہاتھ اسمِ پاک پر رکھ دیے اور اسے رگ و پے میں اترتا محسوس کیا حالانکہ اس لمحے بدنی احساس محو تھا۔ یہ کیفیت الفاظ کے احاطے میں نہیں آ سکتی۔ فقیر نے مشاہدہ کیا کہ سدرۃ المنتہیٰ میں ہر سو تجلیات و انوار ہیں اور لاشریک کے حکم سے وہاں کی نورانی مخلوق سر بہ سجود ہے۔ کچھ قیام میں ہیں، کچھ رکوع میں اور اکثر ایسے ہیں کہ جذب ان کا بیان نہیں کر سکتا۔ بادۂ توحید کا نشہ ہے کہ بے اختیاری طاری کر دیتا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ سردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی نوری مشعلیں ہیں جن پر اسمائے باری تعالیٰ ایسے تابندہ ہیں کہ صفتوں کی چمک کے اظہار میں ہمارے لفظ ماند

پڑ جائیں۔ ان میں سے کچھ کرّ و بین کے سرخیل ہیں۔ پھر ثلاثہ ہیں جو پچھلے تمام سرداروں سے افضل ہیں، ان کا مرتبہ اور تمکنت سب سے بڑھ کر ہے۔

الغرض ہفت افلاک مشاہدات کا عجائب خانہ ہیں۔ مسافر رخصت ہوا اور سارے عجائب دیکھے جو بیان و گمان سے بے نیاز ہیں اور اسی کی گواہی دیتے ہیں جو اطلس، کواکب، ہباء اور اعلیٰ افلاک کا تخلیق کار ہے۔ تاہم یہ صرف نبی کریم ﷺ کا مرتبہ و عظمت ہے کہ معراج کی شب مہمانِ باری تعالیٰ ہوئے اور وہ سب کچھ ملاحظہ فرمایا جو آپؐ کے علاوہ کسی اور پیغمبر یا انسان کی رسائی میں قیامت تک نہیں آ سکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کے منصبِ جلیلہ اور مقامِ محمود سے سرفراز ہوئے کہ اللہ کریم اپنے وعدے کا آپ محافظ ہے۔

تمام بحور، زمینوں اور آسمانوں کے حجابات خاکسار کے سامنے اٹھ گئے اور زائر نے بقدرِ شوق کمالِ قدرتِ الٰہی کا جلوہ کیا۔ مشاہدات میں اس درجہ ترقی عطا ہوئی کہ اسرار کھلتے گئے اور مسافر بہر گام سجدوں کے نشانِ طاعت ثبت کرتا گیا۔ دریائے رحمت جوش میں ہو تو پردے سرک جاتے ہیں اور فنا فی اللہ کی منزل آغاز ہو جاتی ہے۔ علم التوحید سے عین التوحید اور حق التوحید تک کی ہر مسافت سبک رفتاری سے طے ہوتی ہے۔ فقیر کیا عرض کرے کہ انوار و اکرام کیسے چھم چھم برستے رہے اور قلبِ درویش پر کون کون سی تجلی کا ظہور ہوا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھ ایسے ذرّہ حقیر کو قدمِ مصطفوی ﷺ کی نسبت سے رشکِ آفتاب کر دیا گیا۔ جدھر جاتا قدسی حسنِ سلوک سے پیش آتے۔ میں اسمِ ذات اور درودِ پاک پڑھتا جاتا اور نشۂ احمدیؐ میں سرشار مظاہرِ قدرت میں نظر کر کے سبحان اللہ کہتا جاتا۔ زمین و آسمان اور دریاؤں کے عجائبات دیکھ لیے، انبیاء و اصحاب

اور اولیاء و علماء سے ملاقاتیں ہو گئیں لیکن قلب و نظر رخِ مصطفٰیؐ کے دیدار کو مضطرب تھے۔ سیر مکمل ہوئی تو حکم ہوا کہ فوراً دربارِ رسالت مآبؐ میں حاضری دوں۔

وہ عجیب وقت تھا۔ فقیر کی آنکھوں میں توحیدِ الٰہی اور حقیقتِ محمدیہ ﷺ کی دو شمعیں روشن تھیں جن سے مہر و ماہ شرماتے تھے۔ ہر جانب سے مبارک، مبارک کی پرنور صدائیں بلند ہوئیں اور میں نے سرکارؐ کی خدمت میں باریاب ہوتے ہی سر ان مبارک قدموں میں رکھ دیا جن کے نعلین عرش کا تاج ہیں۔ یہ تو اویسیوں اور کمالیوں کی جبلت ہے کہ جونہی سرکارؐ کا نام نامی آیا وفورِ عشق میں سب کچھ بھلا کر روح کی مہمیز سے درِ دولت پہ جا پہنچے۔ حضورؐ نے سر پر دستِ شفقت رکھا اور سفر کی کیفیت دریافت فرمائی۔

عرض کی ..... ''یا رسول اللہ ﷺ! عاشق کا سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ اسے آپ ﷺ کے پائے عرش مقام میں جگہ نصیب ہو اور وہ ساری عمر اسی بوسہ گاہ میں گزار دے۔ فقیر کو آپؐ کا ادنیٰ امتی ہونے کے ناطے وہ کچھ عطا ہوا جس کے بیان کی مجال نہیں لیکن دربارِ اقدسؐ کی جاروب کشی سے بڑھ کر کوئی فضیلت نہیں۔'' میرا اشتیاق ملاحظہ فرما کر سرکارؐ نے اکابرینِ سلسلۂ عالیہ کی جانب نگاہ فرمائی۔ مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ آگے تشریف لائے اور مجھے سینے سے لگا کر فرمایا..... ''بے شک اس روحانی سفر کے تمام انتظامات دربارِ اقدسؐ سے پہلے ہی طے پا چکے تھے اور حضور ﷺ کی ہدایت پر ہی آپ کو عجائبات کے مناظر دکھائے گئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ہر مقام پر عالمِ اسلام کو پیشِ نظر رکھا اور امتِ مسلمہ کے مسائل ہر آن آپ کے سامنے رہے۔ یوں ایک امتحان بھی ہو گیا۔ جن حضرات کو آپ نے ذمہ داریاں سونپی تھیں انھوں نے قابلِ قدر کام سرانجام دیا ہے۔ انشا اللہ عنقریب پاکستان اور دیگر خطوں میں دینِ اسلام کو مزید ترقی ملے گی۔'' حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور

حضرت عثمانؓ نے بارک اللہ کہہ کر نوازا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "بیٹے! اللہ نے آپ کی ادائیگیٔ حج کو نہ صرف شرفِ قبولیت بخشا بلکہ اُس سال آپ "رئیس الحجاج" بھی قرار دیے گئے۔ دورانِ حج والدہ کا خیال رکھنے پر اللہ نے بطور انعام حجاج کے دلوں میں آپ کی عقیدت راسخ کر دی۔ قیامِ منیٰ کے دوران لوگوں کا آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے پر اصرار اور دعاؤں کی درخواست اس سلسلہ میں ایک مثال ہے۔ کیا واپسی پر بھی اس سعادت کی گواہیاں نہیں ملیں؟" میں نے عرض کی...... "یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، یہ سب آپؐ سے نسبت کا شرف ہے۔"

اس کے بعد حضراتِ حسنین کریمینؓ نے میرے شانوں پر اپنے مبارک ہاتھ رکھے۔ حضرت امام عالی مقامؓ نے فرمایا...... "۱۰ محرم کو آپ کی محفل میں شریک تمام لوگوں کی مغفرت کر دی گئی ہے اور آئندہ جو بھی اس محفل میں شامل ہو گا اس کی شفاعت کی ذمہ داری نبی کریم ﷺ کی اجازت سے میں اٹھاتا ہوں۔" میں نے جھک کر مظلومِ کربلاؓ کے مبارک قدموں کو بوسہ دیا۔

فقیر عطاؤں کی بارش میں نہا رہا تھا۔ ایک ابرِ نور تھا کہ چھاجوں برس رہا تھا۔ ایسے میں فخرِ دوعالم، سرکارِ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا.....

"بیٹے کچھ خصوصی اکرام ہیں جنھیں آپ کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ان خزانوں میں سے کسی کو کچھ عطا نہیں ہوا۔ ہم نے آپ کے لیے 'مرج البحرین' کو مراقبۂ خصوصی قرار دیا ہے۔ جیسے 'سلطان الاذکار' میں تمام لطائف ایک ہو جاتے ہیں' ایسے ہی یہ مراقبہ تمام مراقبات کی یکجائی کا مقام ہے۔ جب آپ کسی کے سامنے مرج البحرین یلتقین ہ بینھما برزخ لا یبغین ہ فبای الاء ربکما تکذبن ہ کی تلاوت کریں گے تو اسے آپ کی معیت میں جلوۂ بحرین ہو گا۔ جسے چاہیں یہ مراقبہ

...روا کے مقامِ اتصال کا دیدار کرا سکتے ہیں۔ یہ وہ نسبت ہے جو پہلے کسی کو ملی نہ آئندہ عطا کی جائے گی۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ وہ ایک بار راقم کو یہ مراقبہ کرائیں اور تعلیم دیں۔ اللہ اکبر، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو بھی ساتھ لیا۔ فقیر یہ مقام پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ لیکن ان پاکیزہ نفوس کی موجودگی میں 'مرج البحرین، برزخ اور اللؤلؤ والمرجان' کی حقیقت کھلی تو یہ احساس مزید راسخ ہو گیا کہ یادِ الٰہی سے بہرہ مند، حبِ رسولؐ سے لبریز اور مودتِ اہلِ بیت کا حامل ہی مسافتِ عشق میں بامراد ہو سکتا ہے۔ مراقبے کے بعد مولائے کائناتؓ نے مَرج البحرین کے حوالے سے مزید نکتے تعلیم فرمائے۔ دربارِ اقدسؐ میں پھر واپسی ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا..... ''بیٹے اس مراقبے میں تمام مراقبات کے ارتباط کے باعث آپ کے ساتھیوں کو مظاہر کی اصل کا حال بھی معلوم ہوگا لیکن بہتر ہے کہ ہر کسی پر عطا کا یہ در وانہ کیا جائے۔'' فقیر نے ایک بار پھر ثنائے الٰہی کے بعد درود شریف کا نذرانہ پیش کیا۔ دریائے رحمت جوش میں تھا۔ سرکار ﷺ نے مزید فرمایا...... ''جس طرح کمال صاحب کو درود شریف کی نسبت عطا ہوئی تھی اسی طرح آپ کو بسم اللہ شریف کی نسبت سے نوازا جاتا ہے۔ انشاء اللہ اس کے ورد کے حوالے سے آپ کو وہی انفرادیت اور اختصاص حاصل ہوگا جو درود شریف کے حوالے سے آپ کے والدِ گرامی اور شیخِ مکرّم کو۔'' (میرے حضرت جیؒ اس منفرد اعزاز کے حوالے سے ''حالِ سفر'' صفحہ (۱۱۶) پر رقمطراز ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' --- تم نے امتِ محمدیہؐ کے کثرت سے درود پڑھنے والے پہلے سو اشخاص میں شامل ہونے کی دُعا کی تھی --- مگر اللہ کریم نے اس لحاظ سے تمہیں ساری امت میں اوّل کر دیا۔ سو درود شریف کی تعداد کے لحاظ سے کوئی بھی تمہارا مثیل نہیں۔'')

عرض کی..... ''یا رسول اللہ، غلام کا سب سے بڑا اعزاز تو اپنے حضرت جیؒ کی پیروی میں ورِد درود شریف کے ذریعے آپ ﷺ کی محبت کا حصول ہے۔'' یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے تبسم فرماتے ہوئے ارشاد کیا..... ''بیٹے آپ جانتے ہیں کہ کمال صاحب کو درود شریف کے ساتھ ساتھ بسم اللہ شریف اور کلمہ طیبہ کے خزانوں کی کنجیاں بھی عطا کی گئی تھیں۔ درود شریف اُن کا مقدر تھا لیکن بسم اللہ شریف کے ورد کو اوجِ کمال تک پہنچانے کے لیے آپ کا انتخاب دُعائے کمال ہی کا نتیجہ ہے۔ اطمینان رکھیں بسم اللہ شریف کی تعداد کے برابر آپ کا درود شریف بھی قبول کیا جائے گا۔'' میں نے متوسلین کے لیے رہنمائی چاہی تو سرکار ﷺ نے فرمایا..... ''متوسلینِ سلسلہ اپنی طبعی مناسبت سے دونوں یا کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں۔''

مزید ارشاد ہوا..... ''بیٹے! بسم اللہ شریف قرآنِ کریم کی رونق، خلاصہ اور کلیدِ معرفت ہے۔ یہ انسان کو مظاہرِ قدرت کے عرفان، ذات وصفات کے ادراک اور غور وفکر پر راغب کرتی ہے۔ یہ رب کریم کا محبوب ترین وظیفہ اور میرا پسندیدہ ترین عمل ہے۔ اس میں اللہ کی رحمت اور رحم مل کر جامعیت کو واضح کرتے ہیں۔ اسمِ تعالیٰ میں الوہیّت اور الرّحمٰن الرّحیم میں مقامِ ربوبیت کا ذکر ہے۔ یعنی رحمت اور اس کے تمام پہلو بسم اللہ شریف میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔''

تفسیرِ کبیر، روح المعانی وغیرہم میں حق تعالیٰ کے تین ہزار اسماء کے حوالے سے صراحتاً درج ہے کہ ان میں سے ایک ہزار ملائکہ کو معلوم ہیں اور ایک ہزار کا علم صرف انبیاء کو نصیب ہوا۔ جبکہ بقیہ ایک ہزار میں سے تین تین سو بالترتیب توریت، انجیل اور زبور میں مرقوم ہیں۔ قرآنِ کریم چونکہ آسمانی کتب وصحائف کا نچوڑ ہے، اس لیے اس میں ننانوے جامع ترین اسماء کا گلدستہ پیش کیا گیا جبکہ ایک نام صرف اللہ خود ہی جانتا ہے

لیکن بسم اللہ شریف کے تین الفاظ اللہ، رحمٰن اور رحیم میں مذکورہ تین ہزار اسمائے الٰہی کے معانی اور اسرار و رموز کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ سو جس نے بسم اللہ شریف کا ورد کیا گویا اس نے ربِ کریم کو تین ہزار اسماء کے ساتھ یاد کیا۔

فقیر بسم اللہ شریف کی فضیلت سے کسی حد تک پہلے سے آگاہ تھا اور ایک مخصوص تعداد کا ورد عرصہ دراز سے معمولات میں شامل بھی تھا لیکن آپ ﷺ کی زبانِ مبارکہ سے اس منفرد اور عظیم الشان اعزاز کے بارے میں سُن کر اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ عرض کی ''یا رسول اللہ ﷺ خاکسار ہر نسبت کو آپ ﷺ کے حوالے سے عزیز از جان رکھتا ہے۔'' میری عرض پر تمام اصحابِ کرامؓ نے فرمایا .... ''بے شک، اللہ نے ہر شے اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں پیدا کی اور تمام نسبتیں آپ ﷺ ہی کے لیے ہیں۔''

یہ سُننا تھا کہ رحمت اللعالمین ﷺ مصلّے پر تشریف لے گئے اور ایک طویل سجدہ فرمایا۔ کافی دیر بعد آپ ﷺ نے سرِ انور اٹھایا اور دعا کے بعد میری جانب نگاہِ کرم فرمائی اور ارشاد ہوا.....

۱۔ ''بیٹے! آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا روزِ محشر میرے قریب ہوگا۔

۲۔ آئندہ ہر سالک کی ولایت آپ کی سفارش کی مرہونِ منت ہوگی۔

۳۔ بسم اللہ شریف کا ورد کرنے والا قیامت کے دن آپ کے ساتھ ہوگا۔

۴۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں آپ کے ساتھ نماز ادا کرنے والوں کو لیلتہ القدر کی برکات سے نوازا جائے گا۔

۵۔ آپ سے محبت رکھنے والے کو میری محبت حاصل ہوگی۔

۶۔ ولایت آپ کی اولاد میں کبھی ختم نہیں کی جائے گی۔

۷۔ آپ عبدِ ثانی اور کمالِ ثانی کے القاب سے مقبولِ خلائق رہیں گے۔

۸۔ آپ کے ہاتھ پر اسمِ ذات کا نقش وقت گزرنے کے ساتھ مزید گہرا ہوگا۔''

۹۔ سلسلۂ اویسیہ کمالیہ آپ کے ذریعے ہمیشہ شاداب رہے گا۔

یہاں نبی کریمؐ نے خاموشی اختیار فرمائی تو حضرت عمر فاروقؓ نے مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا..... ''آپ ان انعامات کی خوشی میں وہ کلام سنائیں جو دورانِ حج مکہ مکرّمہ اور مدینہ منورہ میں آپ کے ذہن پر القا ہوا تھا۔'' میں نے دیکھا کہ سرورِ دو عالم نبی کریم ﷺ اجازت مرحمت فرما رہے ہیں تو اپنی اویسی کمالی لے میں حمد سرا ہوا......

ہر سُو سناٹا گونجتا ہے آخر ہے شب میں حاضر ہوں
میں لاج کا مارا کیا آتا رحمت کے سبب میں حاضر ہوں

لبیک لبوں پر جاری ہے اک رعب دلوں پر طاری ہے
اب کیسی پردہ داری ہے اے میرے رَبّ میں حاضر ہوں

جو آیا ابر میں جھوم گیا کوئی بھی نہیں محروم گیا
مجھ پر بھی کرم کی بارش ہو پھر جانے کب میں حاضر ہوں

سب اپنی اپنی بولیوں میں نذرانے لے کر آئے ہیں
آوازیں ہی آوازیں ہیں اور مہر بہ لب میں حاضر ہوں

دنیا کی حرص و ہوس نے مجھے اک عمر یہاں سے دور رکھا
دامانِ شفاعت مل جائے اے آقاؐ اب میں حاضر ہوں

کتنے ہیں جنھیں خود مولا نے خدمت کے لیے بلوایا ہے
میں تو ہوں غلامِ کوئے نبیؐ سو حسبِ طلب میں حاضر ہوں

سنتا تھا فرشتے آتے ہیں اس در کی گدائی کرنے کو
اے شافع دیںؐ، اے نورِ مبیںؐ، اے شاہِ عربؐ میں حاضر ہوں

دہلیز پہ صدیاں کٹتی ہیں تب جا کے حضوری ہوتی ہے
میں بخت پہ نازاں ہوں کہ ہے یہ بزمِ ادب میں حاضر ہوں

میں گوشۂ باغ سے آیا ہوں پھولوں کا دستہ لایا ہوں
دربارِ ادب سے حکم جو ہو قدموں میں تب میں حاضر ہوں

تابش درِ اقدسؐ پر آ کر مخلوق سلامی دیتی تھی
اک عمر ترستے گزری تھی کتنا ہے عجب میں حاضر ہوں

اس دوران احسنت، مرحبا کے توصیفی الفاظ گونجتے رہے۔ پھر آپؐ نے حضرت امامِ حسنؓ کو اشارہ کیا تو انھوں نے چھوٹی سی ایک تھیلی حضور ﷺ کے دستِ مبارک میں تھما دی جسے آپؐ نے سامنے پڑے طشت میں الٹا دیا۔ فقیر نے دیکھا کہ وہ تمام موتی ہیں اور ہر ایک پر کچھ نہ کچھ درج ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے وہ طشت میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا.....

''بیٹے، یاد کیجیے یہ وہ موتی ہیں جو آپ کو آسمان پر چننے کے لیے کہا گیا تھا۔ ان موتیوں پر ایسے اسماء و صفات درج ہیں جنھیں مشترکہ بھی کہتے ہیں اور کمالیہ بھی۔ اگرچہ یہ نام نئے نہیں لیکن اس ترتیب سے آج تک بطور وظیفہ ان کی اجازت کسی کو عطا نہیں کی گئی۔ سلسلہ اویسیہ کمالیہ کی خصوصی نسبت رکھنے اور پوری لگن کے ساتھ حسبِ حکم یہ موتی چننے کے صلے میں آج سے ان اسماء کو آپ کا وظیفہ قرار دیا جاتا ہے۔ آپ

روزانہ کم از کم پانچ بار اس کا ورد کر لیا کریں۔"

حضور ﷺ کے حکم پر حضرت علی المرتضیٰؓ اور حسنینِ کریمینؓ نے مجھے یہ وظیفہ تعلیم فرمایا۔ یوں کہ پہلے یہ تینوں ہستیاں پڑھتی تھیں اور پھر یہ طالب اسے آموختے کی طرح دہراتا تھا۔ وظیفۂ اویسیہ کمالیہ یوں ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰهم صل علی محمدن النبی الامی وعلی اله و صحبه و بارك وسلم

یااللہ یارحیم	یامحمدؐ یاکریم
یااللہ یاسلام	یامحمدؐ یاامام
یااللہ یاسمیع	یامحمدؐ یاشفیع
یااللہ یابصیر	یامحمدؐ یامنیر
یااللہ یاغفور	یامحمدؐ یاشکور
یااللہ یاحسیب	یامحمدؐ یاحبیب
یااللہ یامجید	یامحمدؐ یارشید
یااللہ یاوکیل	یامحمدؐ یاخلیل
یااللہ یامتین	یامحمدؐ یامبین
یااللہ یاولی	یامحمدؐ یانبی

یا ارحم الرحمین ویا خیر الناصرین و الحمدلله ربّ ا لعالمین و الصلوة والسلام

علی خیر خلقه محمد و اله و اصحابه اجمعین برحمتك یا ارحم الرحمین

حضور ﷺ نے فرمایا...... "یہ اللہ پاک کا کرم ہے کہ اسمِ ذات کے حوالے سے

بسم اللہ شریف اور وظیفۂ اویسیہ کمالیہ کے تحائف بھی آپ ہی کو نصیب ہوئے۔"
اظہارِ تشکر کے بعد عرض گزار ہوا...... "یا رسول اللہ! عام طور پر کتابوں میں وظائف درج تو ہوتے ہیں لیکن انھیں پڑھنے کی اجازت تحریر نہیں ہوتی۔ میری درخواست ہے کہ اس کا اذنِ عام ہو۔" آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا "ٹھیک ہے آپ کے متوسلین بھی پڑھ لیا کریں۔"

میں نے دوبارہ جرأتِ لب کشائی کی...... "یا حبیب اللہ! آپؐ تو دشمنوں کو بھی عطا کرنے والے ہیں، آپ ﷺ کا غلام اپنے عزیز و اقارب اور متعلقین کے علاوہ امتِ محمدیہؐ کے ہر فرد کو بھی اپنی دعاؤں اور محبتوں میں یاد رکھتا ہے۔" اس پر سرکارؐ کا چہرۂ انور خوشی سے تمتما اٹھا اور آپؐ نے فرطِ جذبات سے میرے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے فرمایا...... "واہ کمال کا بیٹا بھی کمال ہے۔ ٹھیک ہے بیٹے یہ وظیفہ کتاب میں پڑھ کر یا کسی سے سُن کر اختیار کرنے والے کو بھی وہی اجر ملے گا جو آپ کے متوسلین کو۔"
میری ہمت بندھی اور منہ سے بے اختیار نکلا:

نہیں اس جہاں میں کوئی غیر، سب کی
دُعا ہے ہمیشہ رہے خیر سب کی

"آمین۔" حضور ﷺ نے فرمایا اور اہلِ مجلس نے بھی اس مبارک آواز کے ساتھ اپنی آواز ملا لی۔ پھر آپؐ نے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے فرمایا:
"کچھ اور..........؟"

میں اس بے پایاں کرم نوازی پہ ایک بار پھر اشک بار ہوا اور درخواست کی.....
"یا رسول اللہ ﷺ، غلام ایک بار آپؐ کے روبرو اپنی مرضی کا کلام پڑھنے کی اجازت چاہتا ہے۔"

ارشاد ہوا..... ''اجازت ہے۔''

اس موقع پر فقیر نے اپنی پنجابی کافی بطور ہدیہ عقیدت پیش کی۔

ماہیؐ میرا میماں والاؐ

اَسری دی راتیں دا بنڑا
امبڑ ، آمنہؓ دا من چنڑاؐ
اَن حد تے تعظیماں والا
ماہیؐ میرا میماں والاؐ

سوہنیاں تلیاں دے اوہ چھالے
مزدوری دا مُڑھکا نالے
نوری ہتھ اوہ ڈھیماں والا
ماہیؐ میرا میماں والاؐ

اوہدے ناں تے وٹے بولے
بوٹے ٹرپئے جاں مکھ کھولے
پالن ہار یتیماں والاؐ
ماہیؐ میرا میماں والاؐ

صلی اللہ علیہ وسلم
تابش اوہدے گھول گھمائم
ات اُچّا تکریماں والا
ماہیؐ میرا میماں والاؐ

حاضرین نے لاریب اور ماشاءاللہ کہہ کر داد سے نوازا۔ حضراتِ حسنین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے خاکسار کی یہ کاوش خاص طور پر پسند فرمائی۔ امام حسنؓ نے

ارشاد کیا..... ''ہندوستان کے لوگ، خصوصاً پنجابی صوفیاء عشقِ حقیقی میں بلند ترین مرتبہ رکھتے ہیں۔''

میں اس دوران نگاہ ادب سے جھکائے خاموش کھڑا تھا اور من میں نور ہی نور تیر رہا تھا۔ ایسے میں حضور ﷺ نے فرمایا'' آپ کو بسم اللہ شریف کی ایک اور نسبت سے بھی نوازا جاتا ہے۔ بسم اللہ شریف اور درودِ پاک کو ایک ساتھ ملا کر پڑھا کریں، یہ عمل ربّ کریم کو بہت پسند ہے۔'' عرض کی...... ''یارسول اللہ ﷺ، کیا یہ نسبت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہِ بے کس پناہ سے عطا کی جا رہی ہے؟'' اس پر آپ ﷺ مسکرائے اور ایسا سمجھنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ اس وقت جیسے کسی نے حکیم الامت حضرتِ اقبالؒ کا یہ شعر میری نگاہوں کے سامنے روشن کر دیا ہو۔ عرض گزار ہوا:

ے الله الله بائے بسم الله پدر
معنی ذبحِ عظیم آمد پسر

یارسول اللہ، آپ وجہِ کائنات ہیں اور حضرت علیؓ مولائے کائنات، شہرِ علم کے در اور بسم اللہ کی با۔ یہی وجہ تھی کہ ایسا خیال ہوا۔ اتنا کہنا تھا کہ ہر جانب سے ماشاءاللہ، اجرکم اللہ کی صدائیں آئیں۔ اس لمحے حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ وہ خادم کو سرفراز فرمائیں۔ درِ علم نے اپنے مبارک ہونٹ عاجز کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ اُن لمحات کے بیان کے لیے قلم سورج کی روشنائی چاہتا ہے اور پرِ جبریل خامہ بنے تو کچھ حق ادا ہو۔ تمام حجابات سینے سے لگا کر اٹھا دیے گئے۔ فقیر کو اتنا کچھ اور ایسا کچھ عطا ہوا جو کسی اور نے دیکھا نہ سُنا۔ شیرِ خداؓ نے فرمایا..... ''یاد رکھیں، عشق ہی مسافت اور عشق ہی منزل ہے۔ آج آپ کا نصیب عروج پر ہے مجھے یاد نہیں پڑتا کہ پہلے کبھی کسی کو ایسے نوازا گیا ہو۔''

عاجز نے جھک کر پائے عرش مقام چوم لیے اور دیر تک اشک بہاتا رہا مگر یوں
کہ رُعبِ رسالت سے آواز نہ نکلتی تھی۔ اس حاضری کی آخری بات فقیر کی زندگی کا
حاصل ہے۔ عطائیں اوج پر تھیں کہ حضورؐ نے مجھے قریب بلا کر فرمایا..... ''روحانی
مسافت کو تحریری شکل میں لانے کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔'' آبدیدہ ہوتے
ہوئے عرض کی ''یا رسول اللہ ﷺ جب تک اذن نہ ہو آپ کا غلام ایک لفظ بھی نہیں لکھتا
اور سرکار ﷺ کو میرے ہر قول و فعل کی مجھ سے زیادہ خبر ہے۔'' اللہ اللہ آپؐ ایک بار پھر
مسکرائے اور ارشاد کیا........

''ہم نے آپ کی کتاب کا نام ''سیر الافلاک'' رکھا ہے۔ اپنی روداد لکھیں اور اسی
نام سے شائع کریں۔ سرورق پر بے شک لکھ دیں

''بہ اجازت خاتم الانبیاء، سرورِ کونین، حضور نبی کریم ﷺ''

مزید فرمایا...... ''سفر کے دوران ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور مشاہدات و
انعامات کی ترتیب اسی طرح رکھی جائے جس طرح آپ کے تجربے میں آئے۔
کتاب کا مسودہ باغ صاحبؒ کو ساتھ ساتھ دکھاتے رہیں۔ اس کی اشاعت کی منظوری
البتہ خلفائے راشدینؓ دیں گے پھر آخر میں خود دیکھوں گا۔ 'سیر الافلاک' ایک منفرد
اور جامع تصنیف ہو گی..... اِسے دیکھنے والا بھی حاملِ ثواب ہو گا..... اِسے محبت اور
یقین سے پڑھنے والے کو اجرِ کثیر سے نوازا جائے گا..... جو کسی کو اچھی نیت سے تحفے
میں دے گا اس کے پچھلے صغیرہ گناہ دُھل جائیں گے ..... اسے پڑھ کر عمل کرنے
والے پر نارِ جہنم حرام ہو گی..... آپ کی اجازت سے اس کا درس دینے والا کم از کم
ایک بار میرے دربار (دربارِ اقدسؐ) کی زیارت سے مشرف ہو گا۔''

فقیر کرم کی اس بارش میں ابد تک سرشار تھا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا......

"بیٹے ہم نے "دار الفیضان" کو بیت اللہ اور مسجدِ نبوی ﷺ کی قرابت داری کا درجہ دیا تھا۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے اسے تسلسل دیا جا رہا ہے۔ ہم آپ کی درگاہ کو "دار الکمال" سے ملقب کرتے ہیں۔ اس جگہ کو بیک وقت کرسی وہفت افلاک، بیت اللہ، مسجدِ نبویؐ، نجفِ اشرف اور بیت المقدس سے نسبت عطا کی گئی ہے۔ البتہ اپنی اقامت گاہ کو "گوشۂ باغ" کا نام دیں۔ یہ آپ کی اپنے شیخ کے ساتھ عقیدت اور نسبت کا انعام ہے۔"

عطا و فیض کی کرنیں فقیر کے قلب کو منور کر رہی تھیں۔ وقتِ رخصت قریب تھا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا..... "بیٹے یاد رکھنا، موت برحق ہے۔" یہ سننا تھا کہ خلفائے راشدینؓ کی آنکھیں چھلک پڑیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا..... "لاریب، موت ہر شے کی اصل ہے جس کی جانب لوٹنا مقدر ہے۔ یارسول اللہ ﷺ! بے شک یہ کائنات آپؐ ہی کے لیے بنی ہے مگر جب آپؐ پردہ فرما گئے تو پھر ہمیں سوائے ذاتِ الٰہی کے کچھ بھی مستقل نظر نہیں آیا اور دنیا پر اللہ کی حقانیت زیادہ واضح ہوئی۔" سرکارِ رسالت مآب ﷺ نے فقیر کی جانب نگاہ فرمائی تو میری زبان سے بے اختیار نکلا...... "کل نفس ذائقة الموت (ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔)" اس پر حضورؐ نے فرمایا..... "بیٹے! ایک اور نوید یہ ہے کہ جو شخص آپ کی قبر پر فاتحہ پڑھے گا اللہ تعالیٰ اسے شرک سے محفوظ رکھے گا اور اس کے والدین سے فشارِ قبر کا عذاب دور فرما دے گا اور مراقب ہو کر بسم اللہ شریف کا ورد کرنے والے کو آپ کی زندگی میں فیض یاب ہونے والوں کی طرح نوازا جائے گا۔" سرکارؐ نے بات ختم کرتے ہوئے فرمایا: "لیکن یاد رہے کہ آپ کو عطا کی گئی تمام بشارتیں صرف ارواحِ مقدسہ اور قلوبِ صالحہ پر ہی دستک دیں گی۔"

باری تعالیٰ کی ان بے پایاں عنایات و نوازشات پر میں گریہ کرتا جاتا اور شکر بجالاتا۔ اس دوران میری یہ حالت تھی کہ جیسے حنوط ہوا بیٹھا تھا، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس عالم میں پھر مبارک باد عطا ہوئی اور نبی کریم ﷺ کی اجازت سے حضرت علیؓ نے اسمِ اعظم تعلیم فرما کر "فی امان اللہ" کہتے ہوئے فقیر کو رخصت کیا۔

عجب شب تھی

اِک بزمِ تطہیر میں نور چہرے تھے

میں بھی وہیں سر جھکائے ہوئے تھا

فقط رعب کی حکمرانی تھی جس میں ہر اک شخص لب بستہ بیٹھا ہوا تھا

ذرا آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ اک لوح پر نام لکھے ہوئے ہیں

مرا نام بھی تھا

وہ مہرِ رسالت ﷺ مجھے دیکھ کر مسکراتے

میں قدموں میں سر رکھ کے آنسو بہاتا تو آہستہ آہستہ مجھ کو تھپکتے

اچانک وہ لب ہائے اطہر کھلے

"میرے بچے! کوئی بات کر، کوئی حسرت اگر ہو تو کہہ"

عرض کی "اے حبیبِ خداؐ، نوشۂ انبیاؑ!

ایک مدّت سے میں اسمِ ذاتِ تعالیٰ کو پانے چلا

اور اب تک وہیں ہوں"

تبسم کیا اور گویا ہوئے

''ربِّ اکبر نے اس کو ترے ہاتھ پر لکھ دیا

پڑھ اسے اور پڑھا، دوسروں کو دکھا

یہ تری بندگی کا صلہ ہے''

فرشتے مجھے رشک سے دیکھتے تھے

مرا سر تھا نعلین میں اور پاؤں سرِ آسماں

یہ وہ اعزاز ہے جو شہوں کو بھی حاصل نہیں

اظہارِ سپاس

الحمد للہ۔۔۔اللہ پاک کے فضل و کرم، نبی کریم ﷺ کی شفقتِ پیہم اور نگاہِ شیخِ محترم کے صدقے "سیر الافلاک" آج بروز ہفتہ مورخہ ۹ ربیع الاوّل ۱۴۲۷ ہجری (۸ اپریل ۲۰۰۶ء) تمام ہوئی۔ فقیر نے اس کا عنوان اور متن بعینہٖ ارشادِ حضورؒ کے مطابق رکھا اور واما بنعمت ربك فحدث جیسے آفاقی حکم کی تعمیل میں اپنی روحانی مسافت کو افادۂ خلق اور بطور تحدیثِ نعمت پیش کیا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

آراء کی روشنی میں

○ صاحبزادہ نصیرالدین نصیرؒ (آستانہ عالیہ۔گولڑہ شریف)

آپ کی جانب سے ارمغانِ مطہر ''سیر الافلاک'' کا قلمی نسخہ نظر نواز ہوا۔ آپ کی نعتیں تو کئی بار پڑھی تھیں اس لیے حضوری کا یقین تھا۔ پھر آپ کے شیخ محترم اور والدِ معظّم حضرت باغ حسین کمالؒ کی تصنیفات، خاص طور پر ''حالِ سفر'' کی خواندگی کا شرف بھی حاصل رہا۔ مگر اب جو ''سیر الافلاک'' دیکھی تو گویا قلب کا عالم ہی اور ہے اور روح ہے کہ ''بارک اللہ، ماشاءَ اللہ، سبحان اللہ'' کا ورد کر رہی ہے۔ آپ نے بفضلِ باری تعالیٰ مسلکِ اولیاء کے منکرین کو قرآن و حدیث کے ایسے صاف و شفاف ثبوت دیے ہیں جو ازبسکہ کافی و شافی ہیں۔ آپ ماشاءَ اللہ صاحبِ علم بھی ہیں اور شاعرِ رنگیں نوا بھی لہٰذا میں آپ کے مناصب کی تصدیق و توثیق بھی کرتا ہوں اور اپنی غزل کے دو شعر بھی بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں:

منتخب جس کو وہ فرمائے یہ اُس کی مرضی
کارِ ہر سنگ نہیں لعلِ بدخشاں ہونا
فقر کا تاج جو رکھے ہوئے ہوں سر پہ نصیرؔ
ہیچ ہے اُن کے لیے وقت کا سلطاں ہونا

یقینِ واثق ہے کہ ''سیر الافلاک'' کی اشاعت اہلِ حق کے لیے نوید ثابت ہوگی۔

وما علینا الا البلاغ المبین

○ حضرت واصف علی واصفؒ (معروف روحانی سکالر)

میں آپ کے روحانی اسفار کا مختلف عالمین میں شاہد ہوں۔ کئی بار تو آپ کی زیارت کچھ اس انداز سے ہوئی کہ سبحان اللہ۔ یہ مراتبِ عالیہ صرف غلامانِ محمدﷺ سے ہی مخصوص ہیں اور ان میں آپ کی حیثیت یقیناً ایک نوجوان قائد جیسی ہے، اور کیوں نہ ہو آخر آپ بیٹے کس باپ کے ہیں۔ آپ کی ارسال کردہ نعتیں اور سیر و سلوک سے متعلق نثری تحریریں ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالیں، پھر کئی بار مکرر خواندگی کا لطف اٹھایا۔ جزاک اللہ، عجیب سرشاری ہے کہ الفاظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ تصوف اگر عملی ہو اور انسان کا اثبات کرتا ہو تو بڑی نعمت ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ آپ کی نظم و نثر آرائش سے پاک ہے، ایسی تحریریں ہی دل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

○ جنابِ حفیظ تائبؒ (صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی)

محترمی! ''سیر الافلاک'' کا مسودہ دیکھا، رُوح معطر ہوئی۔ ایک منظر یاد آیا کہ میں اور حضرت باغ حسین کمالؒ سٹیج پر بیٹھے ہیں۔ کسی درس گاہ میں طلباء کے درمیان نعت خوانی کا مقابلہ ہے اور ججوں کی جانب سے آپ کو اوّل انعام عطا کیا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کو چُن لیا۔ حضرت باغ حسین کمالؒ کی ''حالِ سفر'' کے بعد تصوف اور صوفیاء کے باب میں گہر افشانی آپ ہی کا کام تھا اور بے شک آپ نے کہیں گلاب کہیں موتی رکھ دیے۔ آپ کی تحریر، آپ کی صداقت کو پوری طرح عیاں کرتی ہے۔ دلائل اور براہین ثابت کرتے ہیں کہ آپ راہِ سلوک میں یکتا ہیں۔ آپ سے ملاقاتوں میں جب جب گفتگو رہی اُس پر بے اختیار یہی کہنے کو جی چاہتا ہے: تروتازہ، تروتازہ، تروتازہ۔ میں آپ کے

روحانی سفر کو اُس عشق کا انعام سمجھتا ہوں جو آپ کو اللہ جل علی شانہ، اور اُس کے حبیب حضرت محمدؐ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبؐ کے صدقے ''سیر الافلاک'' کو استفادۂ خلق کا ذریعہ قرار دے۔ ناچیز ان دنوں زیادہ علیل ہے۔ آپ سے خصوصی طور پر دُعا کی درخواست ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

○ قاضی عزیز الرّحمٰنؒ نقشبندی، مجددی (ممبر شوریٰ عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت)

''سیر الافلاک'' اللہ کی تائید و مرضی سے خلقِ خدا کی راہنمائی کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ یہ مسالک و مکاتیب کی ناپسندیدہ بحثوں سے پاک، ذہن کو روشنی اور روح کو پاکیزگی عطا کرنے والا ایک عام فہم درس ہے۔ اس کا مطالعہ علوم کے نئے آفاق سے روشناس کراتا اور معانی کے نئے دریچے کھولتا ہے۔ حُبِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کی سعادت نبی کریم ﷺ کی روحانی سرپرستی سے بہرہ مند کسی ہستی کی صحبت میں رہ کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے کہ اس نے نہ صرف ہمیں بہت سے بھولے سبق یاد دلا دیے بلکہ صاحبِ کتاب کی صورت میں ایک عارفِ وقت کی نشاندہی بھی کر دی جو ہر خاص و عام کے لیے بہت بڑی عطا ہے۔

○ صاحبزادہ سید منظور الکونین (صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی)

''سیر الافلاک'' کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہر منزل کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان ہو رہا ہے کہ جیسے میں نے یہ تمام سفر خود طے کیا ہے۔ سبحان اللہ۔ جس طرح خالقِ کائنات نے آپ پر کرم کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہات اور چشمِ عنایت

آپ پر ہوئی ہے، ایسا سننے میں کم آیا ہے۔۔۔آپ نے جس سلاست اور آسان پیرائے میں اپنی حضوریوں کو رقم کیا ہے، رہتی دنیا تک یہ حقائق جگمگاتے رہیں گے۔

○ جناب خورشید عالم گوہر قلم (صدارتی تمغہ حسنِ کارکردگی)

''سیر الافلاک'' اُن روحانی امور و مشاہدات سے متعلق ہے جن تک عامۃ الناس کے اذہان و قلوب کی رسائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف اہلِ حق کا ورثہ ہیں اور وہی ان تجلیات و انوارات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ حقیقت و معرفت کے خوبصورت بیان پر مبنی یہ کتاب خصوصی طور پر سالکانِ طریقت کے لیے رقم فرمائی گئی ہے تاکہ نشانِ راہ مقرر کیا جا سکے۔

حضرت تابش کمال ایک عارف بالیقیں، عاشقِ رسول ؐ اور واقفِ اسرارِ لدّنی انسان ہیں۔ آپ کی شخصیت میں جو نفاست و نزاکت اور پاکیزگی ہے وہ بجا طور پر آپ کے اُن مشاہداتِ حق کا پرتو ہے۔ آپ نے خیال سے لے کر فنائے خودی تک جو اسرار و رموز عیاں کیے ہیں اس سے مجھ جیسے گمراہوں کو یقیناً اُن منزلوں کا پتا چل سکے گا جن تک رسائی کے لیے اہلِ حق کا سہارا لازمی ہوتا ہے۔

---البتہ روحانی اعتبار سے آپ کو ایک ایسے منصب پر فائز کیا گیا ہے کہ حضراتِ اہلِ برزخ آپ پر رشک کرتے ہیں اور اس لحاظ سے مجھے آپ پر ناز ہے۔---اللہ کرے میری علمی و قلمی اور روحانی روایت کو آپ مزید آگے بڑھانے کا موجب بن جائیں۔

(حضرت باغ حسین کمالؒ)

---مگر اب جو "سیر الافلاک" دیکھی تو گویا قلب کا عالم ہی اور ہے اور روح ہے کہ " بارک اللہ، ماشاءاللہ، سبحان اللہ" کا ورد کر رہی ہے۔ آپ نے بفضلِ باری تعالیٰ مسلکِ اولیاء کے منکرین کو قرآن و حدیث کے ایسے صاف و شفاف ثبوت دیے ہیں جو از بسکہ کافی وشافی ہیں۔

(صاحبزادہ نصیر الدین نصیرؒ)

میں آپ کے روحانی اسفار کا مختلف عالمین میں شاہد ہوں۔ کئی بار تو آپ کی زیارت کچھ اس انداز سے ہوئی کہ سبحان اللہ۔ یہ مراتبِ عالیہ صرف غلامانِ محمد ﷺ سے ہی مخصوص ہیں اور ان میں آپ کی حیثیت یقیناً ایک نوجوان قائد جیسی ہے۔

(حضرت واصف علی واصفؒ)

حضرت باغ حسین کمالؒ کی "حالِ سفر" کے بعد تصوف اور صوفیاء کے باب میں گُہر افشائی آپ ہی کا کام تھا اور بے شک آپ نے کہیں گلاب کہیں موتی رکھ دیے۔

(جنابِ حفیظ تائبؒ)

یہ (سیر الافلاک) مسالک و مکاتیب کی ناپسندیدہ بحثوں سے پاک، ذہن کو روشنی اور روح کو پاکیزگی عطا کرنے والا ایک عام فہم درس ہے۔ اس کا مطالعہ علوم کے نئے آفاق سے روشناس کراتا اور معانی کے نئے دریچے کھولتا ہے۔

(قاضی عزیز الرحمٰنؒ نقشبندی)

آپ نے جس سلاست اور آسان پیرائے میں اپنی حضوریوں کو رقم کیا ہے، رہتی دنیا تک یہ حقائق جگمگاتے رہیں گے۔

(صاحبزادہ سید منظور الکونین)

حضرت تابش کمال ایک عارف بالیقیں، عاشقِ رسولؐ اور واقفِ اسرارِ لدنی انسان ہیں۔ آپ کی شخصیت میں جو نفاست و نزاکت اور پاکیزگی ہے وہ بجا طور پر آپ کے ان مشاہداتِ حق کا پرتو ہے۔

(جناب خورشید عالم گوہر قلم)